ہے جن کے فیضِ قدم سے بہارِ صحنِ چمن
نبی کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں

تعمیرِ پاکستان اور علماء ربّانی

☆

مصنّفہ

منشی عبدالرحمٰن خاں

○

ناشر

شیخ اکیڈیمی، بل روڈ، لاہور

ایک تاریخی جائزہ

جس میں

پاکستان کے پس منظر

اس کے ابتدائی تخیل، قائداعظم کی دینی تربیت،
تعمیرِ پاکستان اور تدوینِ آئین کے سلسلہ میں
علمائے کرام کی جدوجہد، جماعتِ اسلامی کی سیاسی
سرگرمیوں اور ہندوستان کے پیش منظر کی تفصیل
پیش کی گئی ہے

○

بار ——— اوّل جنوری ۱۹۷۵ء
ناشر ——— محمد طارق
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— ۱۵/۰۰ روپے
کتابت ——— محمد امین خان

فہرس

احوالِ واقعی

(۱)

جہل انسانی کو دور کرنے کے لیے اس وقت بہترین ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں مگر اس کے باوجود انسان کا علم اس کے جہل سے بڑھ نہیں سکا۔ آئے دن کے انکشافات و اکتشافات نے بیسیوں روایات کو جھٹلا دیا۔ سینکڑوں نظریات کو بدل دیا۔ ہزاروں تصورات کو مٹا دیا اور جو باتیں انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں انہیں حقیقت کا جامہ پہنا دیا بلکہ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ مگر اس کے باوجود ہماری روایات پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہم بعض مبنی برحقیقت انکشافات کو محض اس وجہ سے قبول کرنے میں متامل و متردد ہوتے ہیں کہ ان سے ہمارے مفاد و مقاصد یا ہماری خواہشات و جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔

"سیرت اشرف" کی تالیف کے دوران میں یہ راز کھلا کہ پاکستان کا ابتدائی تخیل علامہ اقبال کا نہیں تھا بلکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تھا۔ اس کی خبر جب اربابِ علم و ذوق کو ہوئی تو انہوں نے اصرار کیا کہ اس تاریخی راز کو سیرت کی اشاعت تک پردہ اخفا میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسے الگ رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے تاکہ ایک تاریخی

غلط فہمی جلد دور ہو جائے مگر حضرت تھانویؒ کے بعض خلفاء نے نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس تقاضا کی مخالفت کی کہ اس انکشاف کی اشاعت سے علامہ اقبالؒ کے عقیدتمندوں کو روحانی صدمہ پہنچے گا۔ چونکہ اس راز کا مزید اخفا ایک قسم کی تاریخی بددیانتی تھی۔ اس لیے کتاب ہذا کے دوسرے باب کو ماہ جون ۱۹۵۵ء میں پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا گیا اور اس کی کاپیاں مغربی پاکستان کے قریباً تمام بڑے بڑے اخبارات اور اہل الرائے حضرات کو تنقید و تبصرہ کے لیے بھیجی گئیں۔ بلکہ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یونائیٹڈ پریس کے مقامی نامہ نگار حکیم محمد سعید صاحب وکیل نے بھی اپنے صدر دفتر کی معرفت اخبارات کو یہ خبر بھیجی۔ مگر اخبارات نے علامہ اقبال کی شخصیت کے رعب اور حلقہ اقبال کی ناراضگی کے خوف سے اس اہم ترین تاریخی انکشاف کا مکمل "بلیک آؤٹ" کیا اور اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی آخری ناکام کوشش کی۔ حالانکہ انہی دنوں شکسپیئر کے متعلق ایک امریکی محقق کا اس قسم کا انکشاف انگلستان اور دنیا کے بڑے بڑے اخبارات میں نمایاں سرخیوں سے شائع ہوا کہ شکسپیئر کی تصنیفات کا اصل مصنف الزبتھ کے زمانہ کا مشہور شاعر کرسٹوفر مارلو تھا۔ جس کے اصل مسودوں کی تلاش کے لیے حکومتِ برطانیہ نے اسے انگلستان آکر والسنگھم کا مقبرہ جو سینٹ نکولاس چرچ جنرل ہرٹ میں واقع ہے، ماہرینِ فن کی نگرانی میں کھولنے کی اجازت بھی دے دی۔ جس سے مشرق کی روایات پرستی اور مغرب کی حقیقت پسندی کا بآسانی موازنہ اور صحافتی ذمہ داریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۲)

اس کے کچھ عرصہ بعد راقم کی تصنیف "شاہدات و واردات" شائع ہوئی جس میں قائداعظمؒ کی دینی زندگی کے بعض گوشوں پر سے پہلی مرتبہ نقاب اٹھایا گیا تھا۔ ارباب نظر

نے تو اُسے بنظرِ استحسان دیکھا۔ مگر ملک کی بہت بڑی اسلامی جماعت کے نقیبوں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ کیونکہ وہ انہیں بہ ہے سے قائدِ اعظم ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کے امیر قائدِ اعظم کو صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں لکھتے ہیں کہ:۔

"لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو"۔ (صفحہ ۳۵)

چنانچہ جہاں ہمارے منطقہ کے صاحبِ دل چیف جسٹس آنریبل ایس۔ اے۔ رحمان صاحب نے متعلقہ ابواب پڑھنے کے بعد یہ تحریر فرمایا:۔

"مشاہدات و واردات" کا کچھ حصہ دیکھا ہے۔ کچھ باقی ہے۔ قائدِ اعظم کے متعلق جو واقعات آپ نے درج کیے ہیں اُن سے کافی متاثر ہوا۔ ایک عجیب قسم کی رقت کی کیفیت تا دیر طاری رہی۔ کتاب واقعی نہایت دلچسپ ہے"۔

وہاں "جماعت اسلامی" کے نقیب "فاران" کراچی کے مدیر شہیر مولانا ماہر القادری صاحب نے یہ لکھا کہ:۔

"اس انکشاف اور ریسرچ پر "مشاہدات و واردات" کے مصنف کو کوئی بڑھیا قسم کا "پرائز" ملنا چاہیئے کہ قائدِ اعظم عارف باللہ بھی تھے مسٹر محمد علی جناح مرحوم کے کچھ ایسے "دینی کارنامے" بھی ہیں، جو ابھی تک پردہ اخفاء میں ہیں" "اُن کی دینی تربیت حضرت مجددالملت مولانا اشرف علی تھانوی مختلف ذرائع سے فرماتے رہے"۔ عجیب سے عجیب تر انکشاف اور نادر

سے نادر تحقیق قائداعظم مرحوم کی زندگی میں اگر اُن سے اس قسم کی باتیں منسوب کی جاتیں تو وہ قہقہہ لگا کر کہتے کہ "خدا کے لیے مجھے وہی رہنے دو، جو میں ہوں"

(فاران دسمبر ۱۹۵۵ء)

علاوہ ازیں بعض۔ دوسرے ظاہر بینوں کی طرف سے بھی شکایتی خطوط پہنچے کہ آپ نے قائداعظم کو عارف باللہ اور مومن لکھ کر کتاب کی اہمیت گرادی اظلم کر دیا وغیرہ وغیرہ مگر کسی کو پیش کردہ واقعات کی حقائق کی روشنی میں تردید کرنے کی ہمت نہ ہوئی بلکہ وہی مقالہ اشاعت سے قبل جب ایک ایسے مشہور اخبار کو شائع کرنے کے لیے بھیجا گیا جو قائداعظم سے وابستگی کا سب سے زیادہ مدعی ہے، تو اس نے بھی اُسے شائع نہیں کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ شاید انہوں کو بھی اس کی دینداری پر شبہ تھا اور غالباً اس لیے قائداعظم کے کسی سوانح نگار نے ان کی زندگی کے دینی اور روحانی پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی اور نہ ہی اُن کے کسی رفیق کار نے اُن کی دینی زندگی کا تفحص کیا۔ کیونکہ وہ تو ملنے والی سلطنت میں اپنا مقام پیدا کرنے کی فکر میں ان کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ورنہ انہیں مرحوم کے گرد جمع ہونے سے اور کوئی غرض ہی نہ تھی۔ البتہ محترم اسد ملتانی نے اپنی ایک نظم میں جو "خضر و مسیحا" کے صفحہ ۲۲ پر شائع ہو چکی ہے۔ قائداعظم کا نقشِ حیات پیش کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ قائداعظم نے ؎

کچھ کلیسا کو بھی دیکھا، دَیر کی بھی سیر کی
جب حرم کا مل گیا رستہ، تو اس پر جم رہا

مگر اس سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ انہیں حرم کا راستہ کس نے دکھلایا۔

دراصل ہر شخص کی زندگی کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ خانگی، مجلسی، سیاسی، علمی،

ادبی وقس علیٰ ہذا۔ جس کو جس شعبۂ زندگی سے زیادہ تعلق اور واسطہ رہتا ہے وہی اس کی تفصیل بتا سکتا ہے۔ دوسروں سے اس کی توقع محض عبث ہوتی ہے اور اگر کسی کی زندگی کا کوئی پہلو روشنی میں نہ لایا جائے تو اس سے اس کے عدم کا قیاس لازم نہیں آتا۔

جس طرح پاکستان کا تخیل سب سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ذہن میں آیا۔ اسی طرح قائداعظم کی دینی تربیت کا خیال بھی سب سے پہلے انہیں کے دل میں پیدا ہوا اور وہی اس سلسلہ میں کوشاں رہے۔ ایک تو اس وقت کے حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ ان مساعی جمیلہ کو پردۂ اخفا میں رکھا جائے۔ دوسرے حضرت تھانویؒ ہمارے رہنماؤں کی طرح پبلسٹی کے دلدادہ نہ تھے کہ وہ اپنی ہر کارگزاری کے متعلق کوئی "منادی" یا "روزنامچہ" یا بیانات شائع کرتے رہتے۔ تیسرے وہ ایسی خدمات کے اظہار کو داخلِ ریا سمجھتے تھے اور "نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال" کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ جس کی وجہ سے حضرت تھانویؒ کی تصنیفات میں ان کی تفصیلات درج نہیں تھیں۔ صرف اشاروں اور کنایوں سے کام لیا گیا تھا اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ قائداعظم کی زندگی کے اس پہلو پر ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے تاکہ معترضین پر حقیقت واضح ہو جائے۔

چنانچہ راقم نے اس سلسلہ میں ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا جو دربارِ اشرفیہ کی طرف سے اس خدمت پر مامور تھے۔ مگر انہوں نے راقم کی درخواست کا بالکل وہی جواب دیا، جو مزاج شناسِ رسولؐ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تدوینِ قرآن کی درخواست کرنے والوں کو دیا تھا کہ "جو کام خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کر گئے وہ میں کیسے کر سکتا ہوں"۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کے خواہرزادہ مولانا ظفر احمد صاحب

عثمانی جو ابتداً تین مرتبہ حضرت کے مرسلہ تبلیغی وفود کے ساتھ اور بعدازاں قائداعظم کے گورنر جنرل بننے کے بعد ان کے پاس جاتے رہے، اپنے ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"محمد علی جناح مرحوم کے ساتھ حضرت حکیم الامت کی جو مکاتبت ہوئی، وہ سب خواجہ عزیز الحسنؒ (مصنف اشرف السوانح) کے توسط ہوئی، یہی حضرت کے مضامین کی انگریزی بناتے اور حضرت کے خط کے ہمراہ انگریزی ترجمہ بھیجتے تھے تاکہ جناح صاحب کو مولانا کا خط سمجھنے میں آسانی ہو۔ اب اگر اس کی اجازت حضرت کو پسند ہوتی تو خواجہ صاحب خود ہی کسی عنوان سے اس کو سوانح میں درج کر دیتے۔ گو جناح صاحب کا نام ظاہر نہ کرتے یا خواجہ صاحب بعد میں اس کو شائع کر دیتے جب یہ کچھ نہیں ہوا، تو اب مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو شائع کیا جائے۔ کہ یہ حضرت کی منشاء کے خلاف ہوگا"۔

اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ حسن اتفاق سے مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ پر حضرت تھانویؒ کے بعض ارشد خلفاء جمع ہوئے۔ اُن کے روبرو اس مسئلہ کی اہمیت پیش کی گئی اور رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ حضرت مولانا محمد حسن صاحب کی سفارش پر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ان واقعات کی تفصیل خود لکھ دی، جو ان کے ذاتی علم میں تھے۔ ازاں بعد حضرت کے برادرزادہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کی خدمت میں راقم خود حیدرآباد پہنچا جو بطور سفیر دربار اشرفیہ ہر تبلیغی وفد کے ساتھ قائداعظم کے پاس جایا کرتے تھے اور بعد ازاں بہت مدت اکیلے جاتے رہے تھے اور جو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ مگر انہوں نے بھی بڑی عرض

معروض کے بعد بعض حالات کی تفصیل لکھ کر بھیجی اور بعض کے اختصار پر وہ راضی نہ ہوئے اور تحریر فرمایا کہ :۔

"زبردست صاحب! زاد مجدکم ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ آپ جب تشریف لائے تھے اور اپنا مقصد ظاہر فرمایا تھا تو میرا خیال ہو گیا تھا کہ اس مقصد کے لیے کچھ ضروری باتیں لکھنی چاہئیں چنانچہ کل لکھنا شروع کیا ۔ آج ارسال خدمت کر رہا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ اس تحریر سے اور ان واقعات سے آپ کا مقصد ضرور حاصل ہو جائیگا میں نے اگرچہ بہت مختصر لکھا ہے مگر انشاء اللہ آپ کے مقصد کے لیے کافی ہوگا ۔ جو مضمون ارسال ہے یہ آپ کی زبردستی ہی سے لکھا گیا ہے ورنہ مجھ سے ممکن نہ تھا" ۔ والسلام احقر شبیر علی

اس کے بعد قائد اعظم کے یارِ غار نواب جمشید علی خانصاحب رئیس اعظم باغپت کی طرف رجوع کیا ۔ جن کے اخلاص کی کشش قائد اعظم اور مس فاطمہ جناح کو میرٹھ کے ایک دور افتادہ قصبہ میں جانے اور وہاں ہفتوں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتی تھی ۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ہر ممکن اعانت فرما کر قائد اعظم کی دوستی کا حق ادا کیا اور نواب محمد اسماعیل خانصاحب صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔پی نے حضرت تھانوی رح کے خطوط روانہ کر کے مدد فرمائی ۔

اس تگ و دو میں قائد اعظم سے براہ راست تعلق رکھنے والے ارباب علم و تقویٰ اور دیانت و امانت سے ان کے تدین کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہو سکیں انہیں کتاب ہذا کے تیسرے باب میں پیش کر دیا ہے ۔ ان حقائق و شواہد کے بعد بھی اگر کسی کو قائد اعظم کے مومن و دیندار ہونے پر شک و شبہ باقی ہے تو اسے معذور و مجبور سمجھنا چاہیے ۔

(۴)

ہمارے معاشرہ کی اخلاقی حالت اس حد تک گر چکی ہے کہ بڑے بڑے مدعیانِ علم وفضل بھی خود غرضی وخود نمائی کے لیے بیانگِ دہل دروغ بیانی اور حقیقت پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ تعمیر پاکستان اور دستور سازی کی جدوجہد میں علماء ربّانی نے جس قدر بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہاں تک کہ ان کے تاریخی کارنامے قائد اعظم اور قائد ملّت کی سوانحعمریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مگر انہیں اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر ہٹانے کے لیے دنیا کو عجیب وغریب فریب میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان کے صدر جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی ایڈیٹر رسالہ "ثقافت" لاہور لکھتے ہیں کہ:۔

"مُلّا کو اسلامی سلطنت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کا تصور ایک نے نواز صاحبِ دل نے پیش کیا اور اس کے لیے قربانیاں کرنے والوں میں مُلّا کہیں نظر نہ آئے۔" (اقبال اور مُلّا صـ۲)

اسی سلسلہ میں جماعت اسلامی کے امیر جناب سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ لوگ (علماء کرام) دنیا کے موجودہ حالات، تقاضوں اور عوام سے بہت حد تک لاتعلق ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کے پاس دین کا علم موجود ہے۔ یہ حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، ان کے افعال حسنہ اور قرآن مجید سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انہیں اس بات کا علم بھی ہے کہ کس صدی میں مسلمانوں کی روایات کیا تھیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود انہیں اس بات کا علم کم

۱۔ ہے کہ اس وقت کے حالات اور ان کے تقاضے کیا ہیں اور اسلام کے اصولوں کو موجودہ حالات میں کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

(الاعتصام ۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء)

اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کی طرف سے عوام میں یہ بھی پروپاگنڈا کیا جاتا رہا کہ قرارداد مقاصد ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے اور آئین کو اسلامی شکل ہماری ہی جدوجہد سے ملی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ کیونکہ جن دنوں قرارداد مقاصد کا مسودہ تیار ہو رہا تھا اور جب وہ پاس ہوئی، ارباب جماعت اسلامی جیل میں تھے اور جہاں آئین اسلامی کی تشکیل کا سوال زیر بحث رہا، وہاں ان کا کوئی جماعتی نمائندہ موجود ہی نہ تھا۔ البتہ گذشتہ انتخابات کی تاریخی ناکامی سے حاصل شدہ سبق کے پیش نظر عوام میں اپنا وقار و اعتماد پیدا کرنے اور آنے والے انتخابات کے لیے میدان ہموار کرنے اور اقتدار کی گدیوں پر قبضہ کرنے والے منصوبے کے ماتحت جماعت اسلامی پریس اور پلیٹ فارم سے دستور اسلامی کا مطالبہ بڑے زور شور سے کرتی رہی۔ مگر شروع میں حصول پاکستان اور جہاد کشمیر کی مخالفت کرنے اور بعد میں علانیہ حکومت کے خلاف غیر ممالک سے امداد طلب کرنے اور پاکستان کو اسلامی ممالک میں رسوا کرنے کی سعی کی وجہ سے ارباب اختیار و اقتدار ان کی آواز سننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ یہ قرارداد مقاصد اور اسلامی آئین تو ان علمائے ربانی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے، جو شروع سے جنگ پاکستان میں قائد اعظم اور قائد ملت کے دوش بدوش کام کرتے رہے اور پاکستان بن جانے کے بعد ان کے مشیر خاص رہے اور آخر وقت حلقہ ارباب اقتدار میں بیٹھ کر اس سلسلہ میں کوشاں رہے۔ مگر ان حضرات کا چونکہ اپنا کوئی پریس اور پلیٹ فارم نہ تھا اور نہ انہیں عوام کی خوشنودی مطلوب تھی۔ اس لیے ان کے تاریخی کارنامون پر پردہ پڑا رہا اور

ارباب غرض انہیں معاملہ نافہم اور سیاست ناآشنا مشہور کر کے ان کے تاریخی کارناموں پر غاصبانہ قبضہ کرنے یا اُن پر پردہ ڈالنے میں مصروف رہے۔

اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس سلسلہ میں بھی صحیح حالات منظرِ عام پر لائے جائیں۔ تاکہ عوام و خواص اس بارہ میں بھی اسی طرح غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں جس طرح تخیلِ پاکستان یا تدبیرِ قائداعظم کے سلسلہ میں کچھ عرصہ مبتلا رہے۔ جب معلومات فراہم کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو بعض امور کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان کی خدمت میں عریضہ لکھا گیا جو تعمیر پاکستان اور دستور سازی کی مہم میں شروع سے آخر تک شریک رہے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ :۔

"اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا مقصد اہم ہے۔ پاکستان کا تصور سب سے پہلے ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی پیش کیا تھا اور مسلم لیگ کو دیندار اور مسلمانوں میں مقبول بنانے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت اور اُن کے خدام کی تحریروں اور تقریروں کا تھا اور دوسرے لوگ اس کیے کرائے کام پر قابض ہو کر اصل کرنے والوں کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ اس نظر انداز کرنے میں اگر کسی کا شخصی نقصان ہوتا تو قابل التفات نہ تھا۔ یہاں تو علماء کی پوری جماعت کو کالعدم اور بیکار ثابت کیا جا رہا ہے۔ مگر حیا مانع ہے کہ اپنی حقیر خدمات کو بزرگوں کے کارناموں کے ساتھ ذکر کرنا، کہیں اُن کے کارناموں کی بے رونقی کا سبب نہ ہو جائے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ مجھ جیسے نااہل و ناکارہ کا تذکرہ بزرگوں کے احوال کے ساتھ مناسب نہیں"۔

آخر بڑی مشکل سے ان سے کچھ معلومات حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور کتاب ہذا

کے چھٹے اور پانچویں باب کی تکمیل کی۔ اس تمام تگ ودو سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی کہ علماء ربانی جہاں اپنے تاریخی کارناموں کو محض اپنے خالق و مالک کی خوشنودی اور ریا و شہرت کے خوف سے چھپانے پر مصر تھے، وہاں انہی کارناموں کی، اپنی خدمات کے طور پر مخلوق کی خوشنودی اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے، جماعت اسلامی نشر و اشاعت میں مصروف تھی۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس جماعت کا کردار اسلامی تھا اور کس کا غیر اسلامی؟ اور مذکرہ صدر ابواب کے مطالعہ کے بعد آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ تعمیر پاکستان اور اسلامی دستور بنوانے میں جماعت اسلامی کا کتنا حصہ تھا اور علماء ربانی کا کتنا؟

اس کتاب کے شروع اور آخر میں پاکستان کے پس منظر اور ہندوستان کے پیش منظر کی وضاحت کے لیے "محرکات پاکستان" اور "مؤیدات پاکستان" کے ابواب کا بھی اضافہ کر دیا ہے اور انتہائی کاوش و کاہش کے ساتھ قریباً ہر واقعہ تاریخ وار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ حالات کی صحیح تصویر سامنے آسکے اور جو معاندین اب تک تخریب پاکستان کے درپے ہیں، انہیں واقعات کے آئینہ میں ماضی و حال کا موازنہ کرنے اور اپنے عزائم مشئومہ پر نظر ثانی کرنے کا موقع مل سکے۔

امید ہے یہ کتاب قارئین کرام کی معلومات میں بیش قیمت اضافہ کرے گی اور آنے والے مؤرخ کے لیے ایک یادداشت کا کام دے گی۔

چہلیک۔ ملتان شہر — احقر العباد

۲۰ر فروری ۱۹۵۶ء — منشی عبد الرحمن خان

محرکاتِ پاکستان

پس منظر اسلام میں فضیلت و برتری محض تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بخلاف اس کے ہندو دھرم میں تفوق و برتری صرف برہمن کو حاصل ہے اور باقی سب غیر برہمن فرقے اس کے غلام و خادم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ویدک دھرم کی رو سے اقتدار و اختیار کے تمام حقوق برہمن اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتا ہے۔

ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی، دوسرے فرقوں کی طرح برہمنوں پر بھی زر و جواہر اور انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔ اکثر بادشاہوں اور صوبیداروں کے میر منشی اور مشیر مال یہی برہمن ہوا کرتے تھے۔ بلکہ رولٹ کمیٹی کی مطبوعہ رپورٹ کے دیباچہ میں درج ہے کہ:-

"ہندوستان صدیوں سے مسلمانوں کی زیر حکومت چلا آیا تھا۔ ان کے ماتحت بھی بعض اوقات وزیراعظم برہمن ہی ہوا کرتے تھے۔" (صفہ ٦)

مگر اس اعزاز و اکرام کے باوجود سرزمین ہند پر اسلامی سلطنت کا وجود ہمیشہ ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا رہا اور وہ مارِ آستین بن کر ہندوستان میں ہندو راج قائم

کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہے۔

سیواجی مرہٹہ

سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں فتنہ و فساد برپا کرنے والا سیواجی مرہٹہ ابتداً اپنے باپ کی جائیداد کی نگرانی پر مامور تھا۔ اسے سادھوؤں اور سنیاسیوں کے اپدیش سننے کا بہت شوق تھا اور اس نے کئی بار ترک دنیا کر کے اپنی بقایا زندگی ایشور بھگتی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اسے سمرتھ رام داس سوامی برہمن نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا اور ہندو راج قائم کرنے کے لیے

"سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش دیتا رہا"۔ (سیواجی صد ۲۴۴) جس سے متاثر ہو کر اس نے اپنا نظریہ بدل لیا۔ وہ ایشور بھگتی کی بجائے مسلم کشی پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے عزائم سے راجہ جے سنگھ کو ایک خط کے ذریعے یوں آگاہ کیا:۔

"میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور مہم کے لیے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیے تھا۔ جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ جنہیں انصاف کرنا آتا ہے۔ میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ خونی مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر لے ن کے ہیو میر بی اے۔ ایل ایل بی نے وضاحتہً لکھا کہ:۔

"سیواجی کے یہ الفاظ اسے اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کو مٹا کر اس ملک کا عام مذہب ہندو دھرم کو بنانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کا

۲۰۴۹۵

بڑا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو حوالۂ شمشیر و آتش کر کے ہندوستان سے ان کا نام و نشان مٹا دے"۔ (الجمیعۃ دہلی ۲ر جون ۱۹۲۷ء صا)

برہمنوں کی چال

۱۸۵۷ء میں جب مسلمانوں نے جنگِ آزادی شروع کی تو برہمنوں نے اسے ناکام بنانے کے لیے اور مسلمانوں کو حوالۂ شمشیر و آتش کرنے کے منصوبہ کو تقویت پہنچانے کے لیے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی اور بطور ففتھ کالم اس میں شریک ہو گئے۔ جس کی تائید "تاریخ غدر ۱۸۵۷ء" کے مصنف مسٹر ہومر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ:-

" ناناصاحب برہمن نے ۱۸۵۷ء کے موسم بہار میں جگہ بہ جگہ پھر کر یہ آگ لگائی تھی"۔

برہمنوں نے یہ چال اس لیے چلی کہ مسلمان پہلے سے کمزور ہیں۔ انگریزوں سے لڑا کر انہیں مزید کمزور کر دیا جائے اور انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے بعد بآسانی اپنی بادشاہت قائم کر کے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اس جنگ کے دوران میں مسلمانوں سے غداری کی اور وہ اس میں ناکام ہو گئے۔

مسلمانوں کو نیچا دکھلانے کے لیے انہوں نے دوسری یہ چال چلی کہ انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے اپنے مسلمان رفقائے جنگِ آزادی کے خلاف مخبریاں شروع کر دیں۔ انگریزوں نے انتقام لینے کے لیے خوب مسلمانوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں۔ جن کی جائیدادیں ضبطی سے بچ گئیں ان پر ہندوؤں نے خود قبضہ کر لیا۔ اس طرح ایک تو مسلمانوں کی انگریزوں کی نظر میں وقعت گر گئی۔ دوسرے ان کی بہت سی جائیداد ہندوؤں کے ناجائز قبضہ میں چلی گئی۔

کانگریس کی بنیاد

مسلمانوں کو مزید نقصان پہنچانے اور اُنہیں اپنے جائز حقوق سے محروم کرنے کی خاطر ان برہمنوں نے تیسری چال یہ چلی کہ اپنی نام نہاد وفاداری کی آڑ میں ایک انگریز مسٹر اے، او، ہیوم کی معرفت لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کو شیشہ میں اتارا اور ان سے ایک سیاسی جماعت بنانے کی اجازت حاصل کر لی۔ تاکہ حاکم و محکوم کے تعلقات کو بہتر اور مفید بنانے کے لیے:۔

"ہندوستان کے سیاستدان اصحاب جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے"۔

(انڈین نیشنل ایولیوشن ص۱۵)

اس طرح انہوں نے ۱۸۸۴ء میں مسٹر اے، او، ہیوم کے ہاتھ سے کانگریس کا سنگِ بنیاد رکھایا اور حکومت کے مشیر بن کر مسلمانوں کو طرح طرح کے نقصان پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

کانگریس کی غرض و غایت

کانگریس بظاہر تو ایک مشیر جماعت کی حیثیت سے قائم کی گئی تھی مگر فی الحقیقت اس کا مقصد حکومت کو مشورے دینا نہیں تھا بلکہ:۔

(ا) ایسے حالات پیدا کرنا تھا جن کے ذریعہ یہ بتدریج حکومت پر قبضہ کر سکے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں بمقام پونا کانگریس کا جو پہلا سالانہ جلسہ ہوا اس میں حکومت سے چند ایسے پر زور مطالبات کیے گئے کہ وہی لارڈ ڈفرن جن کے مشورہ و اجازت سے یہ جماعت معرضِ وجود میں آئی تھی اسے حکومت کا مخالف تصوّر کر کے اس سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔

(ب) اس کا دوسرا مقصد ملک میں ہندو دھرم کا احیاء تھا۔ جن کی وضاحت خود

"تاریخ کانگرس" میں گاندھی جی کے منظورِ نظر، کانگرس کی مجلس عاملہ کے رُکن اور آل انڈیا اسٹیٹس پیپل کانفرنس کے صدر ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیہ نے یوں کر دی کہ :-

"یہ تمام (برہمو سماج اور آریہ سماج وغیرہ کی) تحریکیں حقیقتاً ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں اور اب قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے جس کے ذریعہ تعصبات اور اوہام کو رفع کیا جائے اور قدیم دین یعنی "ویدانتی تصوریت" کا احیاء کرکے اور نکھار کر اسے عہدِ جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جا سکے۔ "انڈین نیشنل کانگرس" کے ذریعہ اس مشن کا پورا ہونا مقدر تھا۔" (پاکستان پس منظر و پیش منظر ص ۶۹)

"نیشنل" کی حقیقت

ہندوؤں نے دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کانگرس ایک ہندو آرگنائزیشن نہیں۔ اس کا نام انڈین نیشنل کانگرس رکھا۔ اس سے ان کا ایک مقصد انگریزوں پر بھی یہ واضح کرنا تھا کہ ان کے پیش کردہ مطالبات کو ملک کے تمام فرقوں کی تائید حاصل ہے۔ حالانکہ کانگرس فی الواقعہ ملک کے تمام فرقوں کی نمائندہ نہ تھی بلکہ یہ ایک خالص ہندو جماعت تھی۔ جس نے "نیشنل" نقاب اوڑھ کر دنیا کو فریب دے رکھا تھا۔ بالآخر ہندوستان کے مشہور برہمن اور کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے کانپور میں تقریر کرتے ہوئے اس کا یہ نقاب یوں اُلٹ دیا کہ :-

"یہ ایجی ٹیشن بالکل بے بنیاد ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں ایسا ہی ہندو ہوں جیسے خود پنڈت مالوی ہیں۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ

خود کانگریس ہندو جماعت ہے۔ اس میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں تھوڑے سے مسلمان شامل ہو گئے تھے۔ ورنہ ابتداء سے یہ ہندو جماعت ہے۔"

(اخبار شیر پنجاب لاہور ۱۹ ستمبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۸)

کانگریس میں شامل ہونے والے "تھوڑے سے مسلمانوں" کی پوزیشن صاف کرتے ہوئے اسی باپ کے بیٹے نامی گرامی برہمن پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا کہ :- "ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے جب تک ہم (ہندو) صحیح راستہ سے نہ بھٹکیں، چند رجعت پسندوں کی (کانگریس میں) موجودگی سے کیا حرج تھا؟" (میری کہانی حصہ اوّل صفحہ ۱۲۹)

ان "رجعت پسندوں" کی جماعتی حیثیت پر آگے چل کر پنڈت جواہر لال نہرو نے یوں روشنی ڈالی کہ :-

"انفرادی حیثیت سے اب بھی قوم پرست مسلمان کانگریس میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جماعت کی حیثیت سے ان کی تباہی کی داستان بڑی دردناک ہے"۔ (میری کہانی حصہ اوّل صفحہ ۲۳۶)

ان "بڑی دردناک داستان" کی شرح کانگریس کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے نے لائلپور میں تقریر کرتے ہوئے یوں کی کہ :-

"وہ دن کسی کو نہیں بھولے جب کانگریس میں کرایہ کے مسلمان لائے جایا کرتے تھے محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہیں اور کانگریس صحیح معنوں میں نیشنل باڈی ہے"۔ (تیج ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۲)

ان حقائق و شواہد کی موجودگی میں یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ کانگریس فی الواقعہ

"نیشنل کانگرس" نہیں تھی۔ بلکہ ہندو کانگرس تھی۔ یہ راز ہمارے اکابر میں سے دو مخلص و بابصیرت رہنماؤں یعنی مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر پر ہی کھل سکا اور وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

رام راج کی مہم

۱۸۹۵ء میں سیوا جی کے جنم دن اور تاجپوشی کی سالگرہ کی یاد میں منعقد ہونے والے میلہ کے موقع پر پونا کے چت پاون برہمن دامودر اور بال کرشن چیپے کار نے "ہندو دھرم کی رکاوٹوں کو رفع کرنے والی سبھا" کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ جیسا کہ اس کے ان شلوکوں سے ظاہر ہے جو اس کے جلسوں میں برملا پڑھے جاتے تھے کہ :-

"محض سیوا جی کی کہانی سنا دینے سے ہی آزادی حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیوا جی اور باجی راؤ کی مانند اولالعزمانہ جانبازی دکھانے پر آمادہ ہو جائیں۔ بہر حال اے لوگو! اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیے کہ ہم نے دشمن (مسلمانوں) کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم قومی جنگ کے میدان میں اپنی زندگیوں کو جوکھوں میں ڈال دیں گے اور دشمن کے خون سے زمین کو سرخ کر دیں گے"۔ (ہندو راج کے منصوبے ص۴۷)

یہ میلہ سال بہ سال لگنے لگا۔ جس کی روئیداد مشہور کانگریسی رہنما تلک جی مہاراج اپنے اخبار "کیسری" میں نمایاں سرخیوں سے شائع کیا کرتے تھے۔

راشٹریہ سیوک سنگ

۱۹۲۵ء میں اس تحریک کو ناگپور کے ایک ڈاکٹر کیشو راؤ بلی رام ہیڈگورو نے "راشٹریہ سوائم سیوک سنگ" کا چولا پہنایا۔ اس کا خیال تھا کہ :-

"ہندوستان کا پورا بر کوچک ہندوؤں کا ہے جو اس میں ہزارہا سال سے رہتے سہتے چلے آئے ہیں اور مسلمان دنیا کے اس حصے میں اجنبی اور غیر ملکی ہیں"۔ (راشٹریہ سوائم سیوک سنگ پنجاب میں صفحہ ۱)

اس جماعت کا نظام نظریات "احیائی" تھا اور اس کے طور طریقے بالکل "فاشی" تھے اس کا اپنا جھنڈا تھا، جو زعفرانی رنگ کا تھا۔ اس کا رہبر اعلیٰ "گروجی" کہلاتا تھا۔ یہ دراصل ایک عسکری جماعت تھی، جس کی وردی کا امتیازی نشان کالی ٹوپی تھی۔ سیاہ رنگ کو ماتمی نشان قرار دیا گیا اور اس رنگ کو ترک کرنے کا وہ وقت مقرر کیا گیا:۔

"جب ہندوستان میں سچی ہندو حکومت دوبارہ قائم ہو جائے گی اور اس کی قدیم شان و شوکت پوری طرح واپس آجائے گی"۔ (بحوالہ صدر صفحہ ۲)

اگرچہ ابتداً اس کا مقصد حیات ہندوؤں کو متحد و منظم کرنا اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ مگر بعد میں اس امر کا بھی اضافہ کر دیا گیا کہ:۔

"اگر ہندو محفوظ رہنا چاہتے ہیں، تو انہیں مسلمانوں کے خلاف نہایت بے دردی سے لڑنا ہوگا۔ گولوالکر نے اپنے دورے کے دوران میں ادھیکاروں (چھوٹے آرگنائزروں) سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور انہیں ہدایت کی کہ ظالم مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنے رضاکاروں کو لاٹھی، تلوار اور برچھیوں کی لڑائی سکھائیں۔ انتہائی رازداری پر بہت زور دیا گیا تاکہ مسلمانوں کو اور حکومت کو سنگ کی طاقت کا اندازہ نہ ہو۔ اس نے کہا کہ اگر سرگرمیاں کافی رازداری سے جاری رکھی جائیں تو حکومت کو دھوکا دیا

جا سکتا ہے ۔" (بحوالہ صدر صٓک)

مسلمانوں کا بائیکاٹ

رام راج قائم کرنے والی سکیم کے دوسرے منصوبہ پر مہاراشٹر سے عمل شروع ہوا ۔ جہاں مسلمانوں کے مکمل بائیکاٹ کا پروگرام بنا کر اخبار " سودھرم " میں شائع کیا گیا ۔ جس کا ایڈیٹر کانگرسی رہنما تلک جی مہاراج کا ایک چیلہ تھا ۔ اس کے ذریعہ ہندوؤں کو یہ ہدایات دی گئیں :-

۱- مسلمانوں کے مذہبی یا دیگر رسوم میں شرکت نہ کی جائے ۔

۲- اپنے ہاں کی رسوم میں مسلمان باجہ بجانے والوں کو نہ بلایا جائے ۔

۳- مسلمانوں سے تجارتی لین دین نہ کریں ۔ خصوصاً مسلمانوں کے مال خریدنے میں محترز رہیں ۔

۴- اراضی کی کاشت صرف ہندوؤں سے کرائی جائے ۔

۵- کسی خانگی کام کے لیے مسلمانوں کو ملازم نہ رکھا جائے ۔

۶- قرضہ کے لین دین میں مسلمان ساہوکاروں یا اسامیوں سے معاملہ نہ کیا جائے ۔

۷- کوئی وکیل کسی مسلمان کا مقدمہ نہ لے ۔

۸- تعزیہ یا دیگر رسوماتِ اہل اسلام میں مالی امداد نہ کی جائے ۔

۹- مسلمانوں کے ہاتھ کوئی جانور فروخت نہ کیا جائے ۔

۱۰- مسجد کی تعمیر یا کسی اور غرض کے لیے زمین نہ مفت دی جائے ، نہ فروخت کی جائے ۔

۱۱- مسلمانوں کا مذبوحہ نہ خریدا جائے ۔

۱۲- مسلمان فقیروں کو کسی قسم کی خیرات نہ دی جائے کیونکہ اس سے فقیر اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں ۔

۱۳۔ مسلمان حکیموں سے ہندو افراد دوا نہ لیں اور ہندو ڈاکٹر یا وید مسلمانوں کو دوا نہ دیں۔

۱۴۔ اگر صرف مسلمان پیشہ ور ہوں، تو ان پیشوں کی ہندوؤں کو تعلیم دی جائے۔

(اخبار وکیل امرتسر، ۲۶ر فروری ۱۹۲۶ء ص۳)

اس چودہ نکاتی پروگرام پر ہندوؤں نے عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کی۔

آریہ سماج تحریک

متذکرہ بالا دونوں تحریکیں تو کانگریسی رہنما تلک جی مہاراج کی زیرسرپرستی مہاراشٹر اور بنگال میں نشوونما پاتی رہیں اور انہی مقاصد کے حصول کے لیے تیسری تحریک سوامی دیانند نے آریہ سماج کے نام سے شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کو شدھی کر کے ہندو مت میں لانا اسلام پر منافرت کے شدید حملے کر کے سیاسی اور مجلسی اشتراک کو ختم کرنا اور ہندو عوام کو مسلم اثرات کے غلبہ سے بچانا تھا۔ یہ اول الذکر تحریکوں کی طرح سیاسی رنگ میں نہیں بلکہ مذہبی رنگ میں وسیع پیمانہ پر نہایت منظم اور مؤثر طریقہ پر چلائی گئی۔ یہ نہایت خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر کام کرتی رہی اور بہت جلد سارے ملک میں پھیل کر مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن گئی۔ اس نے صرف ہندوؤں کو ہی انگریزوں کے خلاف متنفر نہ کیا بلکہ ہندو راج قائم کرنے کے لیے ہر ہندو کے دل میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ یہ تمام تعلیمات دعائیہ ٹریکٹوں اور ستیارتھ پرکاش نامی کتاب کے ذریعے پھیلائی گئیں جن کے متعلق سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنی ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

اس (کتاب) کے چھٹے باب میں ہندوؤں کو ہندو راج قائم کرنے کا تصور

سمجھایا گیا ہے۔ جس کے لیے ایسے بادشاہ اور وزراء کی ضرورت بیان کی گئی ہے جو وید کے عالم اور اس کی تعلیم پر عمل پیرا ہوں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ پارسی، مسلمان اور دیگر اقوام کے لیے سوائے محرومی کے چارہ نہیں"۔

سر مائیکل اوڈوائر سابق گورنر پنجاب نے بھی اس تحریک کے متعلق یہی رپورٹ کی کہ :۔

"آریہ سماج نے ہندوؤں میں تازہ روح پھونکی اور ایسی قوم پرستی کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد نہ صرف ہندو مذہب کو تقویت دینا ہے بلکہ ہندو راج قائم کرنا ہے۔ (اخبار مسلمان ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء ص ۳)

ہندو پریس نے اس تحریک کو یوں ہوا دی کہ ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اس کی ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو :۔

"ایک دن کوئی ہندو ہندوستان میں نہیں ملے گا۔ افسوس یہ ہے کہ وہ دن بہت دور نہیں۔ چار سو ساٹھ سالوں میں سارے ہندوستان میں کوئی ہندو نہیں رہے گا۔ ہندوستان مسلم ستھان اور عیسائی ستھان بن جاویگا آریہ ورت میں انار یہ (غیر آریہ دھرموں کا راجیہ ادھوستار ہوگا"

(پرتاب لاہور ۲۰ اگست ۱۹۲۶ء ص ۲۶)

گئو رکھشا کا فتنہ آریہ تحریک کا ایک جزو گئو رکھشا تھا۔ جس پر سب سے پہلے سوامی دیانند نے لیکچر دیئے، کتابیں لکھیں اور بھارت میں قانوناً گاؤ کشی بند کرانے کی آواز بلند کی۔ جس کی تائید کانگریس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی نے کی۔ اس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو "حوالہ شمشیر و آتش"

کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی اور گئو رکھشا کے سوال پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ ۱۹۲۷ء میں سکھر کے ایک جلسہ عام میں مہاشہ پرتاب سنگھ نے علی الاعلان کہا کہ :-

"اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے لے کر مکہ تک تمام مسلمانوں کو ختم کر دو تو بھی تھوڑا ہے۔ ہندو دھرم میں جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے لیکن مسلمانوں کا خون پینا جائز ہے۔ کسی ہندو کو اس کے پینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے" (تنظیم امرتسر ۴ر فروری ۱۹۲۷ء صلا۱۳)

شدھی اور اچھوت ادھار

آریہ تحریک کا دوسرا جزو مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کے قول کے مطابق :-

"سوامی دیانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شدھی کی طرف راغب کیا" (سوانح سوامی دیانند صـ۱۳۲)

اسے ہندوؤں نے زندگی اور موت کا سوال بنا لیا اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اس تحریک کے بانی شردھانند کی یادگار قائم کرنے کے لیے کانگریسی لیڈروں پنڈت مالوی، لالہ لاجپت رائے وغیرہ نے دس لاکھ روپیہ کی اپیل شائع کی اور شدھی کو ہندو مسلم اتحاد کا نام دیا گیا۔ راجکمار اٹیھی نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

"بلا شدھی ہندو مسلم ایکتا (اتحاد) نہیں ہو سکتی۔ جب تک سب مسلمان شدھ ہو کر ہندو نہ ہو جائیں" (تیج دہلی ۲۰ر مارچ ۱۹۲۶ء صـ۶)

سوامی وچار انند نے گورو کل کانگڑی کی سلور جوبلی کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا :-

"سوراج کے لیے ہندو مسلم ایکتا (اتحاد) ضروری ہے۔ لیکن ہم سچی ایکتا شدھی میں ملتے ہیں۔" (پیغام صلح - ۱۶ر اپریل ۱۹۲۷ء صـ۴)

اور اچھوت ادہار کی تحریک جس کی سرپرستی کبھی کانگریس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی کو حاصل تھی - اس لیے چلائی گئی کہ کہیں ہندوستان کے چودہ کروڑ اچھوت ہندوؤں سے الگ ہو کر مسلم استھان بنانے میں ممد نہ ہوں -

مضحکہ خیز دلیل

مسلمانوں کو ہندوستان سے ختم کر کے ہندو راج قائم کرنے کے سلسلہ میں جاری کردہ ان تحریکوں کے جواز میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ :-

"مسلمان نفی سے سات کروڑ تک پہنچ چکے ہیں - عیسائی چالیس لاکھ ہو چکے ہیں سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے بائیس کروڑ ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر کہیں ان کی تعداد بڑھ گئی تو نہ معلوم کیا ہوگا"۔ (پرتاب ۱۴ر جنوری ۱۹۲۷ء)

اس دلیل کا لنڈن کے مشہور اخبار "نیرّ الیسٹ" نے یوں مضحکہ اڑایا کہ :-

"ہندو اپنی قومی تنظیم کے لیے سبھا قائم کر رہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو قوم اپنی تعداد کے لحاظ سے دو تہائی ہو اسے اپنی حفاظت کی کیوں اس قدر فکر ہے - حفاظت تو ہمیشہ قلیل التعداد قوم کثیر التعداد کے مقابلہ میں کیا کرتی ہے - مگر یہ اُلٹی بات ہے کہ ہندو اپنی اکثریت کے باوجود مسلمانوں کی قلیت کے مقابلہ میں سنگھٹن اور شدھی کی مدد سے اپنی حفاظت کے خواہاں ہیں حفاظت کا تو صرف بہانہ ہے - کیونکہ ہندو لیڈروں کی تقریروں سے جو ہم تک پہنچی ہیں - یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف جاری کی گئی ہے" (مسلم راجپوت امرتسر ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۳ء صـ۲)

ہندو مہا سبھا کا جنم

سیاسیات ہند میں ابتداً مسلمان غیر جانبدار رہے۔ وہ نہ کانگرس میں شریک ہوئے، نہ انہوں نے کانگرس کی مخالفت کی۔ برہمنوں کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کی حکومت کی بارگاہ میں کوئی رسائی نہ تھی۔ بلکہ حکومت ہندوؤں کو مٹھی میں لے کر مسلمانوں سے غدر ۱۸۵۷ء کا انتقام لینے کے لیے تُلی ہوئی تھی۔ ادھر ہندو بھی جو ایک ہزار سال سے مسلمانوں کے محکوم چلے آرہے تھے وہ اب مسلمانوں پر حاکم اور غالب بننا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا کہ انگریزی تعلیم حرام ہے۔ مسلمان اس کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو گئے اور خود یہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری مناصب پر قابض ہو گئے۔ اس طرح انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں پر زیادتیاں کرنے لگے، جس سے تنگ آکر نواب سلیم اللہ خاں نے ڈھاکہ میں راجہ محمود آباد، نواب وقار الملک سر آغا خاں، مولانا محمد علی وغیرہ اکابر قوم کو جمع کر کے اپنی شیرازہ بندی کے لیے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی۔

ہندو جو ہندوستان سے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتے تھے یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ مسلمان اپنی تنظیم کر کے پھر عروج حاصل کریں۔ اس لیے برہمنوں نے مسلم لیگ کے جواب میں اسی سال ۱۹۰۶ء میں ہی ہندو سبھا قائم کر دی۔ جیسا کہ پنڈت موتی لال نہرو کی علیگڑھ والی تقریر سے ظاہر ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

"۲۰ سال پیشتر پنڈت مالویہ جی نے الہ آباد میں جو ہندو مہا سبھا قائم کی میں اس کے سرگرم کارکنوں میں سے تھا۔" (پرتاب ۱۷ر نومبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۵)

گویا ہندو مہا سبھا کو مسلمانوں کی مخالفت کے لیے سر پی، سی چیٹرجی، لالہ لاجپت رائے پنڈت مالویہ اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے پرانے کانگرسیوں نے ہی پیدا کیا تھا۔ جن کا کام

مسلمانوں کو "ٹھیک" کرنا تھا۔ جیسا کہ روزنامہ پرتاب لاہور کے ایڈیٹر نے اپنے ۱۰ اگست ۱۹۲۵ء کے پرچہ میں صلا پر لکھا کہ :-

"ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ ہندو سبھا کی ضرورت ہے مستقل طور پر نہیں بلکہ عارضی طور پر اور صرف اس وقت تک جب تک کہ مسلمان سیدھے راستہ پر نہیں آتے۔"

مسلمانوں کو سیدھا راستہ بتانے کے لیے ہندو مہاسبھا کے مہالیڈر ڈاکٹر مونجے نے اجودھیا میں اودھ کی تیسری ہندو سبھا کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ :-

"جس طرح انگلستان انگریزوں کا، فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں کا ہے اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔

ہندو آج سے اپنی دنیا الگ بسائیں گے اور شدھی اور سنگھٹن سے اس کارخانہ کو رونق ہوگی۔" (زمیندار ۲۴ اپریل ۱۹۲۷ء صلا)

تقسیم کار

جناب رئیس احمد جعفری "حیاتِ محمد علی جناح" میں لکھتے ہیں کہ :-

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب سارے ہندوستان پر بادشاہت کریں گے۔ مغربی جمہوریت کو وہ اپنے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ سمجھ رہے تھے۔ مسلمانوں کو غلام رکھنے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ ہندوستان پر جمہوریت یعنی ہندو اکثریت کی حکومت ہو۔" (ص ۳۴۶)

اب تقسیم کار یوں ہوئی کہ :-

الف :- مسلمانوں کو حوالۂ شمشیر و آتش کرنے کا کام تو مذکورہ بالا مذہبی جماعتوں کے سپرد کیا گیا۔

ب :- ہندوستان میں اکثریت کی حکومت قائم کرانے کا فرض کانگریس کو سونپا گیا۔

ج :- چونکہ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق اقلیت کو بھی حصّہ ملنا تھا جو یہ نہیں دینا چاہتے تھے مگر اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کانگرسیوں نے اصلاحات کے موقعہ پر واویلا کرنے کا کام ہندو مہاسبھا کے سپرد کیا تاکہ مسلمان اپنا صحیح اور جائز حق حاصل نہ کرسکیں

اصلاحات کی مخالفت

اصلاحات کا دور منٹو مارلے سکیم سے چلا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت اور جُداگانہ ہستی کو تسلیم کرکے نمائندگی کا کسی قدر الگ حق دیا گیا۔ اس پر مہاسبھا والوں نے بڑا شور وغوغا کیا۔ اس کے دس سال بعد جب آزادی کی دوسری قسط ملنے کا وقت آیا تو اس خیال سے کہ مبادا مانٹیگو چیمسفورڈ کی مجوزہ سکیم میں مسلمانوں کو مزید حقوق ملتے ہوں ہندوؤں نے جلسوں اور اخباروں کے ذریعہ ہنگامہ برپا کیا اور مسلمانوں کے خلاف مانٹیگو اور چیمسفورڈ کو جا کر ملے جیسا کہ کانگڑہ ہندو کانفرنس کے صدر پنڈت دین دیال کے اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ:-

"لکھنؤ میں جو ہندو مسلم پیکٹ- معاہدہ ہوا تھا- اس (ہندو مہا) سبھا نے بڑے زور سے اس پر پروٹسٹ کیا- جب مانٹیگو یہاں آئے تو اس سبھا نے ہندوؤں کے مطالبات بھی ان کے سامنے پیش کیے تھے" (ملاپ ۵ راگست ۱۹۲۵ء صد ۲)

اس کے بعد اصلاحات کی تیسری قسط دینے کے لیے جب سائمن کمشن آنے لگا، تو اس وقت ہندوؤں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور ان کے نمائندہ اخبار ملاپ لاہور نے اپنی ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں صد پر ڈنکے کی چوٹ لکھا کہ:-

"اس وقت ملک کی حالت اور خصوصاً پنجاب[1] اور بنگال کی حالت تو یہ تقاضا کرتی ہے کہ سارے ہندوستان یا پنجاب کی طرف سے یہ آواز بلند کی جائے

---

[1] کیونکہ یہاں مسلمان اکثریت میں تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ برسرِاقتدار تھے۔

ہمیں اصلاحات درکار نہیں ۔ اصلاحات کا موسم جب سے شروع ہوا ہے ۔ ہندوؤں کے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ یک زبان ہو کر اصلاحات کے خلاف آواز اٹھائیں اور گورنمنٹ کے پاس میموریل بنا کر بھیجیں کہ ہم ان اصلاحات کے بغیر ہی اچھے ہیں ۔ ہمیں ایسے سوراجیہ کی ضرورت نہیں جس کی انتہا افغانی حکومت پر ہوتی ہے ۔ پنجاب کے دُور اندیش ہندو برملا کہہ رہے ہیں کہ پنجاب کو بجائے اس کے کہ مزید اصلاحات دی جائیں ، پرانی اصلاحات سے بھی محروم کر دیا جائے ۔ پنجاب کونسل کو توڑ دیا جائے ، وزارتوں کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ فرقہ وارانہ نیابت اور جدا حقوق کے زہر کو یہاں سے نکال دیا جائے اور لیاقت نیز قابلیت کے لحاظ سے ہندو مسلمانوں کو زندہ رہنے دیا جائے ۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں کی اس آواز کو سُنے ۔ وہ دوسرے صوبوں کو جو چاہے دے دے لیکن کم از کم پنجاب کو پرانی اور آنے والی اصلاحات سے معاف ہی کر دے ۔"

مخالفت کی وجہ

ہندوؤں نے ان اصلاحات کے خلاف آسمان کیوں سر پہ اٹھایا ۔ اس کا جواب خود ملاپ کا ایڈیٹر یہ دیتا ہے کہ :۔

"مسلمانوں کی اصلاحات کی بدولت اتنے اختیارات مل چکے ہیں اور ان اختیارات کا پچھلے سات سالوں میں اتنا ناجائز استعمال ہوا ہے کہ مسلمانوں کے دماغ میں اب صرف ایک ہی خیال ہے اور وہ یہ کہ پنجاب میں اسلامی حکومت ہو ۔"[1]

---

[1] کیونکہ وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی ۔

آزادی کی مخالفت

ہندوستان کو سوراجیہ دلانے اور آزاد کرانے والے دیش بھگت تو صرف ایسا سوراج چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کو غلام بنایا جاسکے۔ مگر ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آیا۔ اس لیے انہوں نے بنگال۔ پنجاب سرحد، سندھ اور بلوچستان کی آزادی پر بھی بڑا واویلا کیا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کیونکہ اس طرح مسلمان مرکز کی اکثریت کے چنگل سے نکل جاتے تھے۔ چنانچہ جب اسمبلی میں سرحد صوبہ کی آزادی کا سوال اٹھا تو ہندوؤں نے اسے زندگی اور موت کا سوال بنا لیا اور اُن کے "آریہ گزٹ" نے اپنی ۱۱ مارچ ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ :۔

"ان اصلاحات نے ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ بے چینی کے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے اور سرحدی صوبہ اپنے جھگڑوں سے پہلے ہی لبریز ہے۔ یہ اصلاحات تو وہاں بارود میں چنگاری کا کام دیں گی۔ اس لیے ہر ایک امن پسند انسان کو ان کی مخالفت کرنی چاہیئے"۔ (ص)

سندھ کی آزادی کے وقت مہاسبھائی لیڈر لالہ پرمانند نے صاف کہا کہ :۔

"میری رائے یہ ہے کہ سندھ کی علیحدگی کا سوال اب صرف سندھ کے ہندوؤں کا ہی نہیں رہا بلکہ جیسے ہندوستان کے تمام مسلمان لیڈر سندھ کی علیحدگی پر زور دیتے ہیں ویسے ہی تمام ہندوؤں کو زور سے اس کی مخالفت کرنی لازم ہے۔ جبل پور کی ہندو مہاسبھا نے اس کا فیصلہ کر کے تمام ہندوؤں کے جذبات کی نمائندگی کر دی ہے"۔ (ملاپ ۲۱ جون ۱۹۲۸ء)

اسی طرح بلوچستان کی آزادی کی مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ :۔

"بلوچستان اور سندھ فوجی صوبہ جات ہیں۔ ان کی آبادی کے تحفظ کیلئے ان کا نیم فوجی رکھا جانا ضروری ہے۔ ان کو زیادہ سے زیادہ حق یہ دیا جاسکتا ہے کہ ان کو ایک ریگولیشن صوبہ بنا دیا جائے۔ سندھیوں، بلوچستانیوں اور سرحدیوں کی تعلیمی اور مجلسی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ایک اصلاح شدہ اور آزاد صوبہ کی ذمہ داریوں کے متحمل ہوسکیں۔" (ملاپ ۱۲ جنوری ۱۹۲۸ء ص۲)

سوراجیہ پر لات

ہندو بڑی دور اندیش قوم ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ایسے حالات میں انہیں آزادی بڑی مہنگی پڑے گی اور جس غرض یعنی مسلمانوں کو غلام بنانے کے لیے اسے حاصل کیا جانا تھا وہ مقصد اس سے موجودہ حالات میں حاصل ہونا ناممکن ہے۔ اس لیے اس نے ایسے سوراجیہ سے دور ہی رہنا بہتر سمجھا اور ان کے ترجمان اخبار ملاپ نے اپنی ۲۵ مارچ ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں صاف صاف لکھ دیا کہ :-

"اب ہندو ہمیشہ کے لیے اس کھیل کو جاری رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ایسے سوراجیہ کے خواہش مند نہیں، جس میں ہندوستان کے حصے بخرے ہوجائیں۔ صوبہ سرحد کوئی لے جائے۔ سندھ پر کوئی قابض ہوجائے اور بنگال پنجاب پر کوئی تسلط جمالے اور باقی ہندوستان ان سے گھرا ہوا ہمیشہ کارگ سیر رہے۔ ہندو ایسے سوراجیہ پر لات مار دیں گے"۔ (ص۴)

یہی بات سر شنکرن نائر نے کونسل آف اسٹیٹ میں کھڑے ہو کر ہندو قوم کے منتخب نمائندہ کی حیثیت سے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے گورنمنٹ سے بھی کہہ دی کہ :-

"جب تک ہندو اور مسلمان لیجسلیٹو کونسلوں میں فرقہ وارانہ نیابت کی بنا پر ممبروں کے انتخاب کو نہیں چھوڑتے اس وقت تک ہندوستانی کونسلوں

اور اسمبلی کے ممبران کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے اور نہ کچھ نئی اصلاحات دی جائیں اور نہ ہی مزید اختیارات دیئے جائیں۔ حتیٰ کہ ذمہ دار گورنمنٹ قائم کرنے کے لیے مزید کارروائی نہ کی جائے" ۔ (ملاپ ۲۲ مارچ ۱۹۲۷ء ص ۲)

تجویز پاکستان

یہ وہ حالات تھے جن کے ماتحت ہندوستان میں مسلمانوں کو حوالۂ آتش و شمشیر کرنے کے لیے مختلف رنگ میں مختلف تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ زبان پر آزادی اور اتحاد کے نعرے تھے، مگر دل میں اسی طرح مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے ارادے تھے جس طرح سیواجی نے افضل خاں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔

ان تحریکوں کی وجہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے جائز حقوق غصب کیے جا رہے تھے۔ ان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور کانگریسی مسلمان ان واقعات کو مقامی ہنگامی مناقشات قرار دے کر مسلمانوں کی نظروں میں ان کی اہمیت گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہندوستان کے وسط میں ایک غیر معروف قصبہ تھانہ بھون کی ایک تاریخی کہنہ مسجد میں بیٹھا ہوا دور بین اور دور اندیش درویش یعنی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی چشم فراست سے صاف دیکھ رہے تھے کہ خاک و خون کا یہ ڈرامہ اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ ہے جس کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا ہے اور اسے خالص ہندوستھان بنانا ہے جس کی تائید کلام پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی تھی:۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط	کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر

اس لیے انہوں نے مذکورہ بالا حالات کا جائزہ لینے کے بعد مسلمانانِ ہند کا مفاد اسی میں دیکھا کہ وہ ان ازلی دشمنوں سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں اور ایک خطہ میں اسلامی حکومت قائم کر کے اطمینان کی زندگی بسر کریں۔

چنانچہ جون ۱۹۲۸ء میں جب کانگرسی لیڈر مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور خلافتی لیڈر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت تھانویؒ نے انہیں کھلے لفظوں میں فرمایا کہ :-

"دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین وغیرہ اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیے"۔ (سیرۃ اشرف باب نہ)

مگر ان حضرات نے یہ جانتے ہوئے کہ ع "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"۔ اسے کوئی اہمیت نہ دی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ چونکہ اس زہر کا تریاق سوائے پاکستان کے اور کوئی نہ تھا اس لیے حالات سے مجبور ہو کر حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قوم کو وہی مشورہ دیا جو جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ کانگرسی علماء کو دے چکے تھے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ :-

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں (کیونکہ) یہ امر کسی طرح مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت

کا نفاذ کیا جائے ۔ لہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے ، بالکل حق بجانب ہے ۔"

(خطبۂ صدارت الہ آباد کانفرنس)

گویا مجدد وقت کی غیبی تائید اس دور کے مردِ قلندر نے بھی کر دی جسے قائدِ اعظم نے عملی جامہ پہنایا ۔

تخیّلِ پاکستان

داستانِ پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی کی زبانی آشنا ہوئی۔ جب کہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصّہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا جس کا ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں نصب العین کے طور پر ایک قرارداد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرارداد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزا کے طور پر اچھالا جو قائداعظم کی کوششوں سے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصّۂ شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا، بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (جو ابتداً کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے) کے معتمدِ خاص بلکہ دستِ راست

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی (جو اب تک کانگرس کے حامی ہیں) کے مرید با تمیز مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور اپنی اس اوّلین ملاقات کا حال اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا:۔

"۱۹۲۸ء سنہ تھا اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائرکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ جس نے بھی ایسا کہا، جان کر یا بے جانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرتِ ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آواز یہیں کان میں پڑی۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریقِ کار سے پورا اتفاق نہ تھا۔ لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفسِ مقصد یعنی حکومتِ کافرہ سے گلوخلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومتِ وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر"

(نقوش و تاثرات ص ۲۲۳)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس مردِ مجاہد کا ہے جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے، بلکہ کانگریس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور جو آج اربابِ کانگریس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "سچی باتیں" سنانے میں ہند و پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے۔ آپ کے لیے ان کا یہ انکشاف موجبِ حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علامہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظرِ عام پر لائی جا رہی ہے۔ مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جا سکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ ان "رہنماؤں" میں سے نہ تھے، جو اپنی "ملکی و ملی خدمات" اور اپنے "حقیقت افروز بیانات" اخبارات میں شائع کرانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ایسے رہنما اور مصلح تھے، جو انبیائی طریق پر نہایت خاموشی کے ساتھ اصلاحِ اُمّت اور خدمتِ خلق میں مصروف تھے۔ جو ایسی خدمات کا اظہار، نمود و نمائش اور ریا میں داخل سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ اپنی سوانح حیات کا لکھا جانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جس کی تفصیل "سیرتِ اشرف" میں آ چکی ہے۔ مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ ہیں:-

"یہ مردِ درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا۔ مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مصروف

تھا۔ اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویرِ حیات کی اس شبیہ کے مطابق بنا دے، جو دینِ حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔"

(جامع المجددین صفحہ ۲۸)

بنائے پاکستان

مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ کی لوگوں کے دلوں میں عظمت ان کی اسلام آموز شاعری کی وجہ سے ہے۔ مگر ہمارے دل میں ان کی عزت اس نورِ معرفت کی وجہ سے ہے، جو ان کی شاعری کی روح ہے اور جسے وہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اسی پہ انہوں نے اپنے نظریہ پاکستان کی بنیاد رکھی ہے وہ اپنے مذکورالصدر تاریخی خطبۂ صدارت میں لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا صاف طور پہ اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

"اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔"

اس ابتلاء کے وہ دو سبب بتاتے ہیں :۔

(الف) ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں، پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ملتِ اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا"۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو اعانتِ ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور تقدیر کیا ہے ۔ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں ۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی

قوتِ عمل کا انحصار ہوتا ہے۔

(ب) دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے' یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

اس ابتلاء سے بچنے کی وہ یہ صورت بتلاتے ہیں :-

"مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے نازک دور میں سے گذر رہے ہیں اس کے لیے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے' یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں' تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

اس لیے وہ اکابرِ قوم کو دعوت دیتے ہیں کہ :-

"تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں' فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قراردادیں منظور نہ کریں۔ بلکہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کیلئے مسلمانوں کے لیے کوئی راہِ عمل پیش کریں۔"

تاکہ قوم کو اس دورِ ابتلاء و آزمائش سے نکالا جائے۔

راہِ عمل

دیکھنا یہ ہے کہ ۲۹ ردسمبر ۱۹۳۰ء سے کسی دوسرے رہنما کو بھی انہی حالات کا احساس ہوا اور اس نے قوم کے سامنے کوئی ایسی راہِ عمل پیش کی، جس کے لیے علامہ اقبالؒ نے اکابرِ قوم کو دعوت دی تھی۔ اس سوال کا جواب ہمیں حضرت تھانویؒ کے ایک ملفوظ اور ایک مکتوب سے ملتا ہے۔

عین اس زمانہ میں جب کہ جنگِ پاکستان شباب پر تھی اور اطراف و اکنافِ ہند سے روزانہ دربارِ اشرفیہ میں لیگی اور غیر لیگی حضرات کی طرف سے رہنمائی کی درخواستیں پہنچ رہی تھیں، حضرت تھانویؒ سے سوال کیا گیا۔ وہ کون سے اسباب ہیں کہ جن کو اختیار کرنے سے مسلمان موجودہ پستی اور تنزل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ :-

"بفضلہ تعالیٰ ایسی تدابیر موجود ہیں اور ان کو ضبط کر کے رفاہِ عامہ کے لیے شائع بھی کر دیا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور بربادی سے بے چین ہو کر دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے ایک کا نام صیانۃ المسلمین ہے اور دوسری کا نام حیات المسلمین ان دو کتابوں کے اندر میں نے ان مصائب کا جو اس وقت مسلمانوں پر آرہے ہیں، پورا پورا علاج کر دیا ہے۔ مسلمان پہلے ان ہی دو کتابوں پر پورا پورا عمل کر کے دیکھیں کہ ان کو کتنا نفع ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عمل تو کرتے نہیں۔ بس شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہماری رہبری نہیں کرتے۔"

(ملفوظ نمبر ۳۰ از ملفوظات حصہ ششم)

مسلم لیگ کا دعوت نامہ

۲۳ یا ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے ارکان مسلم لیگ نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا تاکہ آپ آکر ہمیں ہدایات دیں جس کے الفاظ یہ تھے :۔

"آپ اس موقع پر خود دہلی تشریف لاکر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہتر ہو لیکن اگر حضور تشریف نہ لاسکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمادیں۔ اور دعا فرمادیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کردے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہو سکے۔ الخ" (خاتمۃ السوانح ص۸۹)

یہ حضرت تھانویؒ کی وفات سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے جب کہ آپ ضعف اور مرض کی شدت میں مبتلا تھے۔ اس لیے بامر مجبوری آپ نے شرکت اجلاس سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ان کو یہ تاریخی خط لکھا :۔

حضرت تھانویؒ کا جواب

از ناکارہ ۔ آوارہ ۔ ننگِ انام ۔ اشرف برائے نام ! بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرا اللہ و نصرہم اللہ !

السلام علیکم ۔ لیگ کے عزائم معلوم کرکے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی ۔ قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عذر نہ ہوتا ، تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا ۔ انفروا خفافاً[1] و ثقالاً ۔ لیکن عذر کے سبب اس رخصت

---

[1] (جہاد کیلئے) نکل پڑو تھوڑے سامان سے (خواہ) زیادہ سامان سے ۔

پر عمل کی اجازت مل گئی۔ لیس علی الضعفآء علی المرضیٰ ولا علی الذین لا یجدون ماینفقون حرج اذا نصحوا للّٰہ ورسولہٖ۔[1] لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیام عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین تشخصی اصلاح کے لیے دوسری صیانت المسلمین جمہوری نظام کے لیے۔ ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ہیں جن میں وہی فرق ہے، جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں اور نمائندہ وہ کام نہیں کر سکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں۔ مگر عمل شرط ہے۔ جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں اس کا نفع اس وقت ظاہر ہوگا، جب حلق سے اُترے گا۔ ورنہ بدون عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی۔ نشستند و گفتند و برخاستند۔ باقی دعا ہر حال میں بخصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔ بقول کسی شاعر کے ؎

لا خیل عندک تہدیہا ولا مال[2]

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

نوٹ: یہ دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں، تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے ہدیۃً روانہ کر دوں گا۔ ورنہ دہلی کے کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام!

---

[1] کہ ناتوانوں اور بیماروں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسّر نہیں۔ جب کہ یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ خلوص رکھیں۔

[2] یعنی تیرے پاس امداد کرنے کے لیے نہ گھوڑے ہیں نہ مال ہے۔ ایسی حالت میں تیری زبان (نطق) تو کام دیتی ہے۔

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیات المسلمین بلاقیمت جا سکتی ہے۔ سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانت المسلمین یہاں نہیں ہے۔ لہذا وہاں تلاش کرائی جائے۔

احقر اشرف علی تھانہ بھون (بحوالہ صدر)

یہ دونوں کتابیں اسی دعوت کی داعی ہیں جو حضرت تھانوی رح نے مسلم لیگ کو ۱۹۳۸ء میں اپنے پیغام میں دی تھی کہ :-

"جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمانوں کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور امدادِ الٰہی کی شرط احکامِ الٰہی کی پابندی ہے۔ جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک مسلمان سچ مچ مذہبی دیوانے بنے رہے، دنیا اُن کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے۔" (آثار رحمت صہ ۱۰۹)

وحدتِ خیال ارباب مسلم لیگ نے اسلامی سلطنت قائم کرنے کے سلسلہ میں حضرت تھانوی سے جو ہدایات طلب کیں، ان کے جواب میں حضرت تھانوی رح اپنی دو مذکورہ الصدر کتابیں پیش کرتے ہیں جو

(ل) قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیامِ عمل ہیں اور

(ب) جن میں وہ راہِ عمل مذکور ہے جس کے متعین کرنے کے لیے علامہ اقبال رح نے ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابرِ قوم کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی تھی اور جو

(ج) اِنہیں حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں، جن کا علامہ اقبال رح نے مذکورہ بالا تاریخ کو لیگ کے تاریخی اجلاس میں اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ ان کتابوں کے دیباچوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

حیات المسلمین کے دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں :۔

"اس وقت مسلمانوں پر عالم میں عموماً اور کشورِ ہند میں خصوصاً مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جارہی ہیں۔ مگر نہ ان کی طرف ان کے ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر اس کا نام آتا ہے، نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے۔ اگر کسی کو علاج وتدبیر کی طرف توجہ ہوتی ہے، تو وہ نسخے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کے متعلق بے تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں جو مزاج میں بجائے درستی کے نادرستی پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان مصائب کی تشخیص میں ان کو نصوص الٰہیہ و نبویہ (قرآن وحدیث) کی پوری تصدیق نہیں ہوتی"۔

صیانت المسلمین کے شروع میں درج ہے کہ :۔

"ہمارے بھائیوں میں اجتماع، اتفاق، تنظیم قریب قریب مفقود ہے۔ اس لیے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے۔ ورنہ اہلِ باطل کے مقابلہ میں اہلِ حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراضِ دنیویہ مقصود ہیں۔ بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں، ان میں دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لیے کہ سکوتِ محض سے کام لیں۔ نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں، نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقویاء کے لیے کہ حفاظت ومدافعت کی تدبیر کریں، اپنے لیے بھی

اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بھی"۔

اسی زمانہ اشاعتِ صیانتہ المسلمین میں آپ نے فرمایا :۔

"کانگریس ایک منظم جماعت ہے اور اہلِ حق کی کوئی منظم جماعت نہیں ہر شخص تنہا ہے، اس لیے ہر شخص خوفزدہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اہلِ حق کے اندر ایک جماعت ایسی منظم ہو، جو ان ظالموں (ہندوؤں) کو دفع کر سکے (کیونکہ) ان لوگوں کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں پر یہ لوگ چڑھ آئے اور حملہ کر دیا۔ حالانکہ مسلمانوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ بیچارے مسلمان حیران و پریشان تھے اور کچھ نہ کر سکے اس لیے مسلمانوں کو ضرور اپنی حفاظت کا سامان کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر ان لوگوں کی جرأت بڑھ گئی تو پھر مسلمانوں کا جان و مال سب خطرہ میں ہے۔ مگر اب مشکل یہ ہے کہ ایسی منظم جماعت آئے کہاں سے ؟"

(جمہوری نظام ص ۲۶-۲۵)

حیات المسلمین اور صیانت المسلمین کی ان وجوہِ تصنیف کو اگر علامہ اقبال کے ان ارشادات کے آئینہ میں دیکھا جائے جو شروع میں نقل کیے گئے ہیں تو یہ دونو حکمائے امت تشخیص مرض اور تجویز علاج میں متفق اللسان نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت تھانویؒ جن خطوط پر مسلمانوں کی بہبودی اور مستقبل کے متعلق راہِ عمل تجویز کر چکے تھے۔ اس کی طرف علامہ اقبالؒ کا ذہن بعد میں کارفرما ہوا۔

اس مرحلہ پر یہ ذکر بے جا نہ ہو گا کہ حضرت تھانویؒ جن خطرات کو جولائی ۱۹۳۰ء میں دیکھ رہے تھے قوم نے ان کا خونین نظارہ پورے سترہ سال بعد اگست ۱۹۴۷ء

میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ع قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!

شرفِ اولیّت

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اپنی جن دو کتابوں کو حصولِ پاکستان اور بقائے پاکستان کے لیے بطور راہِ عمل پیش کیا ہے، وہ کب منظرِ عام پر آئیں؟"

ملکی اور ملّی حالات کے برسوں مشاہدہ اور جائزہ کے بعد حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں کی شخصی اصلاح کے لیے وسط ۱۹۲۵ء سے حیات المسلمین لکھنی شروع کی، جو اڑھائی سال میں لکھی گئی اور مورخہ ۲۷ر نومبر ۱۹۲۷ء کو (جیسا کہ اس کے دیباچہ کی تاریخ سے ظاہر ہے) مکمل ہو کر ۱۹۲۸ء کے آغاز میں شائع ہوئی۔ "صیانت المسلمین" جو جمہوری نظام کے متعلق تھی جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی جیسا کہ اس کے اختتامی نوٹ کی تاریخ سے ظاہر ہے۔

یہ تاریخیں صاف بتلا رہی ہیں کہ جن مصائب کا علاج حضرت تھانوی ۱۹۲۸ء یا جولائی ۱۹۳۰ء میں تجویز فرما چکے تھے، انہی مصائب کا علاج سوچنے کے لیے علامہ اقبال ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابرِ قوم کو دعوت دے رہے تھے۔

پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی نظامِ پاکستان چاہتے تھے، جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظم نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا اور جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

اس سوال کا جواب حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی اس اوّلین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا کہ:-

"پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (نقوش وتاثرات صٓ۲۳)

ہماری درخواست پر اس "بالکل صاف جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا دریابادی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ:-

"حضرت کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگِ آزادی"، "جنگِ حقوق"، "آزادیٔ وطن" وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں، تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجرا احکام شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظام زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیے۔"

گویا دربار اشرفیہ میں حصول وبقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظام پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہُوا، جب کہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنے دارالاسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا، قائداعظم بھی اسی کے مطابق نظام پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ جب

حیدرآباد تشریف لے گئے تو ان سے "اسلامی حکومت" کی وضاحت چاہی گئی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں نوجوان طلباء کو بتلایا کہ:-

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لیے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔" (حیاتِ قائدِ اعظم ص ۴۲۸)

غرضیکہ ۱- انہی اصولوں پر قائدِ اعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

۲- انہی اصولوں کی حکومت کے لیے قوم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا، جو جنگِ پاکستان کے ہر مرحلہ پر پوچھتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ تو اسے جواب دیا جاتا تھا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

۳- انہی اصولوں کے مطابق دربارِ اشرفیہ کے فیض یافتہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے "قرار دادِ مقاصد" پاس ہوئی۔

۴- انہی اصولوں پر پہلی مجلس دستور ساز نے نظامِ مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

۵- انہی اصولوں کی تعلیم پہلی مجلس دستور ساز نے مملکت کے مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دی تھی۔ اور

۶- انہی اصولوں پر چلنے میں پاکستان کے بقاء کا راز مضمر ہے۔

عملی جدّ وجہد

حضرت تھانویؒ نے صرف حصول پاکستان کے لیے راہِ عمل یا نظامِ پاکستان کا خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا تھا، بلکہ اس لیے عملی جدّ و جہد بھی اسی زمانہ سے شروع کر دی تھی۔

۱۔ سب سے پہلے آپ نے ہی ہندوستان میں اسلامی قوانین رائج کرنے کی مہم شروع کی تھی، جس کی تفصیل آپ کو "سیرتِ اشرف" میں "آئینی سرگرمیوں" کے باب میں ملے گی۔

۲۔ سب سے پہلے کانگریس کے خلاف اور مسلم لیگ کی حمایت میں جماعتِ علماء میں سے دربار اشرفیہ ہی سے اعلان جاری ہوا، جس کی تفصیل "سیرتِ اشرف" میں "سیاسی کشمکش" کے باب میں ملے گی۔

۳۔ سب سے پہلے حضرت تھانویؒ ہی نے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائداعظم میں تدین پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی تفصیل "تدین قائداعظمؒ" کے باب میں ملے گی اور

۴۔ سب سے پہلے حصولِ پاکستان کے لیے جہاد کی تیاری بھی حضرت تھانویؒ نے فرمائی۔ جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے:-

جہاد کی تیاری

حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علی گڑھی لکھتے ہیں کہ:-

"احقر بعونہٖ تعالیٰ تقریباً چودہ سال مستقل طور پر محی السنت، حکیم الامت، مجدد الملت، مرشدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کے دربارِ گہربار میں رہا۔ اس عرصہ میں احقر نے وقتاً فوقتاً خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم کا بیان ہوتا،

تو حضرت حکیم الامت رح پر ایک خاص کیفیت کا ورود و مشاہدہ کیا جاتا آنکھیں سُرخ ہو جاتیں اور حاضر باش کو ہلا ہتا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں - ایک بار قرب و جوار کے ایک مسلمان نے اپنی کسی مستعدی کا اظہار کیا - مسکرا کر فرمایا کہ اچھا اگر ضرورت ہوئی تو تم سے جہاد کا کام لیں گے - اسی طرح ایک بار صوبہ سرحد کے ایک والیِ ریاست نے دوستانہ تعلقات کو وسیع کرنا چاہا، تو حضرت نے اس سے عذر ظاہر فرمایا - مگر یہ بھی فرمایا کہ ہاں وقت آئیگا تو آپ سے جہاد کا کام لیا جائیگا " (آثار رحمت ص۱۰۱)

مرکز اور امام کی ضرورت

جہاد خواہ کسی نوع کا ہو، اس کے لیے مرکز اور امیر کا ہونا بڑا ضروری ہے - جس کے لیے حضرت تھانوی رح بڑے متفکر تھے - چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب مسلم لیگ کے نام آپ کے تاریخی پیغام کا مسودہ تیار کیا گیا، تو مسودہ تیار کرنے والے مولوی صاحب نے اس میں ایک یہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا کہ کہ لوگوں کو جب نماز روزہ کی ترغیب دی جاتی ہے تو یورپ زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کیا ہوتا ہے - تو اس فقرہ کی تصحیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :-

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے - اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روز کامیابی کے لیے کافی ہے - بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے - بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال جہاد ہے - کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا، بھلا صحابہ رض سے بڑھ کر نماز روزہ کس

کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجیے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی، قتال ہوا، اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی، تو غلبہ ہوگا اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔" (آثار رحمت ص ۱۰۴)

چونکہ قائد اعظمؒ کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لیے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی۔ تاکہ وہ ان تمام ضروری

صفات سے متصف ہو جائیں، جو ایک امیر المومنین کے لیے ضروری ہیں۔
حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جد و جہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرار داد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا، بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی جد و جہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاولون کا ہے۔

تدین قائداعظمؒ

تعلیم و تربیت

قائداعظم کے سب سوانح نگار اس امر پر متفق اللسان ہیں کہ قائداعظم ایک معروف شیعہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے [کسی دی]نی درسگاہ میں باقاعدہ مذہبی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بلکہ میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی تقریباً [س]ولہ سال کی عمر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ جہاں [و]کالت پاس کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے سیاسی بصیرت بھی حاصل کی تھی۔ قائداعظم کی تعلیم و تربیت چونکہ ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں مذہب کو سیاست سے بالکل [الگ] رکھا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں کے اثرات کے ماتحت وہ بھی مذہب و سیاست [ک]و الگ الگ رکھنا چاہتے تھے۔

انگلستان سے واپسی

ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت کے قیام کے سلسلہ میں سب سے پہلے [و]سط ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ سے جو آواز بلند ہوئی تھی' وہ علامہ اقبال [کی] تائید غیبی سے ۱۹۳۰ء کے آخر میں عوام تک پہنچ چکی تھی اور اسی سال قائداعظم سیاسیات [ہن]د سے عارضی کنارہ کشی کر کے لندن چلے گئے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب وہ یہاں واپس تشریف [لائ]ے تو بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس وقت :-

"مسلم سیاست ایک جسدِ بے جان تھا اور عام طور پر یہی محسوس کیا جاتا تھا کہ مولانا محمد علی مرحوم کا جانشین مسلمانوں کو ملنا دشوار ہے۔ مسلمان اہلِ فکر اپنے سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بددل تھے۔ مسلمان رہنما یا تو انگریزوں کی خوشامد کو اپنا شیوہ بنا چکے تھے اور جو اس طرزِ عمل سے بیزار تھے، وہ ہندو سیاست کا شکار تھے۔ ایک جماعت انگریز پرست سمجھی جاتی تھی اور دوسری ہندو پرست۔ مسلمانوں کے مفاد کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں سے الجھنے والے یا کم از کم ایسے لوگ جو اسلامی مفاد کو دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھیں، بہت کم تھے"

(نوائے وقت ۲۶ دسمبر ۱۹۵۵ء)

قائدِ اعظم کی للکار

۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ انگریز اور کانگرس، تو قائدِ اعظم نے انہیں بروقت للکارا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہی نہیں۔ ایک تیسرا فریق بھی ہے یعنی مسلمان۔ تو اس شیر کی گرج سے کانگرس کے ایوان اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ ادھر مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کو لیگ کا مستقل صدر منتخب کرکے اور نئی انتخابی پالیسی کا اعلان کرکے کانگرس کو چیلنج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگرس نے اپنی توپوں کا رُخ قائدِ اعظم کی طرف پھیر دیا اور بقول مسٹر خورشید حسن:۔

"ایک طرف تو ہندوستان میں کانگرسی اور ان کے زرخرید ایجنٹ قائدِ اعظم کو کافر، مغربی تہذیب کا دلدادہ، اسلام سے بے بہرہ اور انگریز کا پٹھو کہہ کر ان سے مسلمانوں کو دُور رکھنے کی ناکام کوشش کرتے رہے اور

عامۃ المسلمین کو بھڑکاتے رہے اور ساتھ ہی دوسرے بیرونی ممالک اور خاص کر انگلستان میں ان کے سفیر قائداعظم کو رجعت پسند، فرقہ پرست لکیر کے فقیر، مذہبی جنونی اور نہ جانے کس کس فرضی رنگ میں پیش کر کے آزادی پسند انگریز قوم کی نظروں میں ان کی سیاسی پوزیشن کمزور کرتے رہے۔"

(بحوالہ صدر)

احساسِ تبلیغ

مگر بمصداق ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کانگرس اور اس کی معاون مسلم جماعتوں کی ہر تخریبی کوشش تعمیرِ ملت کا باعث بنتی گئی مسلمان جو ہندو سامراج اور انگریز سامراج کے درمیان گیہوں کی طرح پس رہے تھے۔ جہد للبقا کے لیے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے اور مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیرِ کمان ان کی حفاظت و مدافعت کے لیے مورچہ لگا دیا۔ اگرچہ اس وقت تک عام طور پر یہی خیال تھا کہ :۔

"نہیں بنے گا پاکستان"

مگر تھانہ بھون کا مردِ دور بین اپنی چشمِ فراست سے صاف دیکھ رہا تھا کہ :۔

"بن کے رہے گا پاکستان"

اس لیے اس دُور اندیش اور خیر اندیش کو اب یہ فکر دامنگیر ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں جو اسلامی سلطنت قائم ہو، اس کا نظام کتاب و سنت کے مطابق ہو اور یہ تبھی ممکن تھا کہ امیرِ سلطنت اور ارکانِ سلطنت خود کتاب و سنت کے پیرو ہوں۔ اس لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اربابِ مسلم لیگ کو تبلیغ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

بشارتِ اشرف

جس کی تفصیل تھانہ بھون کے رئیسِ اعظم دربارِ اشرفیہ کے سفیر، خانقاہ امدادیہ کے مہتمم اور حضرت تھانوی کے برادر زادہ حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کی "رودادِ تبلیغ" میں یوں درج ہے:

"واقعہ مئی ۱۹۳۸ء کا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا جو حضرت حکیم الامت کی سہ دری کے سامنے تھا۔ حضرت حکیم الامت دوپہر کا کھانا نوش فرما کر قیلولہ کے لیے خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنی سہ دری میں پہنچ کر مجھے آواز دی۔ میں فوراً حاضر ہوا اور سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت سر جھکائے ہوئے کچھ متفکر تشریف فرما تھے۔ اس زمانہ تک پاکستان کا مشہور ریزولیوشن لاہور پاس نہیں ہوا تھا۔ مگر کانگرس اور ہندوؤں کی ذہنیت بہت کچھ بے نقاب ہو چکی تھی اور عوام و خواص کی زبان پر یہ آگیا تھا کہ ہندو کے ساتھ مسلمان کا نباہ ناممکن ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے علیحدہ سلطنت قائم کرنا ضروری ہے۔ غرض حضرت نے دو تین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور جو ارشاد فرمایا، اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور بحمد للہ حافظہ میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"میاں شبیر علی! ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی، وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں اور بھائی آج کل کے

حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جاوے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی، تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس! تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو"۔

مَیں نے یہ ارشاد سُن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے؟ اس پر ارشاد فرمایا کہ:۔

"اُوپر کے طبقہ سے۔ کیونکہ وقت کم ہے۔ خواص کی تعداد کم ہے اور **الناس علیٰ دین ملوکھم**۔ اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے تو انشاءاللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی" (روئیداد صا۲)

ترتیب وفد

۲۴ جون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اربابِ لیگ کو تبلیغ کرنے کی غرض سے حضرت تھانویؒ نے اس اجلاس کے زمانہ میں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپ نے حضرت مولانا شبّیر احمد صاحب عثمانی کو اس وفد کا امیر مقرر فرمایا اور مولانا شبّیر علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم صاحب گم تھلوی اور سہارنپور کے ایک تیسرے صاحب کو اس

وفد کے ارکان کے طور پر انتخاب فرمایا۔ وفد کے اخراجات کے لیے آپ نے مبلغ تین سو ۳۰۰ روپیہ اپنی جیبِ خاص سے مولانا شبیّر علی صاحب کے حوالے کیے اور انہیں فرمایا کہ:

"مولانا شبّیر احمد ریل کے جس درجہ (سیکنڈ یا فرسٹ) میں سفر کرنا چاہیں۔ اُن کے لیے اسی درجہ کا ٹکٹ لیا جائے اور تم لوگ تھرڈ یا انٹر میں سفر کرنا۔ اگر بمبئی میں خرچ کی اور ضرورت ہو تو حکیم سعید صاحب گنگوہی (معروف بحکیم اجمیری) سے لے لینا اور بمبئی ہی سے بذریعہ خط اس قرض کی رقم کی مجھے اطلاع دے دینا تاکہ میں اُن کو روانہ کر دوں واپس آکر بتاؤ گے تو ادائیگی میں دیر ہو جائے گی"۔ (روئیداد ص۲)

مولانا شوکت علی کو اطلاع

آپ نے وفد کی روانگی کی اطلاع مولانا شوکت علی مرحوم کو بھیج دی اور احتیاطاً مندرجہ ذیل خط جناب محمد اسمٰعیل خانصاحب بیرسٹر ایم' ایل' اے و صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو پی کو بھی لکھ دیا۔

"مکرم و محترم جناب نواب محمد اسماعیل خانصاحب صدر مسلم لیگ صوبہ یو پی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'!

گرامی نامہ بدست جناب وصل صاحب بلگرامی موصول ہوا۔ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ الحمد للہ! آنجناب نے بھی شرکت علماء کی اہمیّت کو محسوس فرمایا۔ حسب مشورہ سامی آج ایک خط مولانا شوکت علی صاحب کی خدمت میں اس وفد کے قیام وغیرہ کے انتظام کی بابت لکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کھانے کا انتظام یہ حضرات

خود کریں گے۔ قصہ یہ ہے کہ انشاء اللہ یکم جون کو یہاں سے روانہ ہو کر یہ حضرات ۳؍جون کی صبح کو ایکسپریس سے بمبئی پہنچیں گے۔ امید ہے جناب والا اس وفد کی شرکت کے لیے مسٹر محمد علی صاحب جناح اور دیگر اراکین مسلم لیگ سے اس درمیان میں تمام معاملات ضرور طے فرمالیں گے۔

والسلام۔ اشرف علی تھانہ بھون"

وفد کو ہدایات

مسلم لیگ کے روح رواں مسٹر محمد علی جناح سے گفتگو کرنے کے متعلق حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو حسب ذیل ہدایات دیں:-

جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں، وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیرالوفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہت بہتر آتا ہے۔ لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے، تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو۔ اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آدیں۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا اور دوسری گفتگو شروع کر دینا۔ اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو، تو لہجہ تنقیدی نہ ہو بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو۔ الفاظ بھی نرم ہوں اور کلموا الناس علی قدر عقلولھم کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے۔ جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں کہ میں فتح پور ہسوہ سے الٰہ آباد جا رہا تھا۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہم سفر ہو گئے۔ مجھے

وہ پہچانتے نہ تھے۔ مگر صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتّا پالنا کیوں منع کیا ہے۔ حالانکہ اس میں تو بہت سی صفات اچھی ہیں یہ زمانہ وہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں بہت زور تھا۔ میں اگر ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسولؐ کے احکام بیان کرتا تو بحث کا دروازہ کھل جاتا اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتّے کے پالنے کی برائی بیٹھ جائے، حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ کتّے میں ساری صفات مسلّم، مگر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے تو فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی یہ جنس پاس رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آوے گا۔ تو یہاں اس کا لحاظ رہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ لیکن مخاطب کے فہم کا بھی ضرور لحاظ رہے۔" (روئیداد ص۳)

علّامہ شبّیر احمد کا عذر

یہ ہدایات لے کر مولانا شبّیر علی صاحب یکم جون کو دیوبند کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ دوسرے ارکان وفد کو ہمراہ لے کر مولانا شبّیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت تھانوی کا والا نامہ پیش کیا۔ اتفاق سے مولانا موصوف کی والدہ ماجدہ سخت علیل تھیں جس کے پیش نظر انہوں نے عذر فرمایا۔ مولانا شبّیر علی صاحب نے بہت اصرار کیا، مگر مولانا عثمانی والدہ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے۔ جس پر ارکان وفد واپس تھانہ بھون

آگئے اور تمام واقعہ حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا جس سے حضرت کو بہت گرانی ہوئی اور یہ فرمایا کہ "بہتر ہے الخیر فی ما وقع" خاموش ہو گئے اور مندرجہ ذیل خط نواب محمد اسماعیل خانصاحب کو لکھ دیا۔

اطلاع التواء

"مکرم و محترم جناب محمد اسماعیل خانصاحب زاد فضلکم!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ!

جناب کو اس سے قبل اطلاع دی گئی تھی کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں ۲۴ جون کو علماء کا وفد شریک ہوگا اور جناب نے اس کے لیے مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے چند ذمہ داری قبول فرمائی تھی۔ مگر اتفاق سے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کی والدہ صاحبہ کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اس لیے مولانا موصوف کی روانگی بھی مشکوک ہو گئی۔ جس کی جناب کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ وقت پر تار سے مکرر اطلاع دی جاوے گی کہ وفد روانہ ہوا یا نہیں۔ والسلام۔ احقر اشرف علی عفی عنہ!

مکرر آنکہ:۔

چونکہ وفد کی روانگی قطعی طور سے ملتوی نہیں کی گئی بلکہ احتمال ہے کہ وقت پر روانہ ہو جائے، اس لیے احتیاطاً آپ جملہ انتظامات درست فرمانے میں دریغ نہ فرمائیں"۔

مگر حضرت کو فوری طور پر کوئی ایسا موزوں آدمی نہ مل سکا جو مسٹر جناح سے حضرت کی حسب منشاء گفتگو کر سکتا۔ کیونکہ حضرت تھانوی جانتے تھے کہ مسٹر جناح بقول علامہ سید سلیمان ندوی:۔

"بڑے قانون داں، بڑے مناظر اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے اور اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے۔ اُن کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی"۔ (یاد رفتگان صـ ۴۲۲)

اس لیے ان سے گفتگو کرنے کے لیے بھی ایک صاحب اثر و تاثیر، موقع شناس اور معاملہ فہم کی ضرورت تھی۔ جس کے بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وفد روانہ نہ ہو سکا۔

دوسرا تبلیغی وفد

اس موقع کے ضائع ہو جانے کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہونا قرار پایا۔ جہاں سب ارباب و ارکان لیگ کا اجتماع تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی نے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک اور تبلیغی وفد مرتب فرمایا، جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری، مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہوی پر مشتمل تھا۔ آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کو رئیس الوفد مقرر فرمایا اور بغرض اخراجات مبلغ دو سو روپیہ اپنی جیب خاص سے مولانا شبیر علی صاحب کے حوالے کیے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ سب پٹنہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب وکیل کے ہاں قیام کریں، جو حضرت کے جاں نثار خادم تھے۔ اس وفد کی آمد کی اطلاع مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو بھی پٹنہ بھیج دی۔ تاکہ وہ اس کے قیام کا انتظام کر چھوڑیں۔

روانگی وفد

۲۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا شبیر علی صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا عبدالجبار صاحب تھانہ بھون سے روانہ ہوئے۔ مرادآباد میں امروہہ سے آکر مولانا معظم حسین صاحب اور آگے مولانا عبدالغنی صاحب بھی

مل گئے۔ احتیاطاً مولانا شبیر علی صاحب نے مراد آباد سے ہی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو حسب ہدایت حضرت تھانوی تار بھی دے دیا کہ ہم فلاں گاڑی سے آرہے ہیں۔ اگلے روز صبح ۶ بجے یہ وفد پٹنہ پہنچا۔ اسٹیشن پہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب معہ دیگر حضرات بلغرض استقبال موجود تھے اور رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب پہلے ان کے مکان پہ پہنچ چکے تھے۔ لیگ کا اجلاس اسی روز سے شروع ہونا تھا۔ مولانا شبیر علی صاحب اپنی "روئیداد" میں لکھتے ہیں کہ :۔

اہتمام ملاقات

ہمارے بعض ساتھیوں نے اجلاس میں شریک ہونا چاہا، مگر میں نے عرض کیا کہ ہم اس وقت آزاد نہیں ہیں، بلکہ حضرت کے فرستادہ ہیں۔ جب تک جناح صاحب سے گفتگو نہ ہو چکے اور ہم یہ نہ دیکھ لیں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں ہم جلسہ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں ابھی نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کے پاس جاتا ہوں اور ان کی معرفت جناح صاحب سے وقتِ گفتگو مقرر کیے لیتا ہوں۔ چنانچہ میں اسی وقت نوابزادہ صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے فوراً جا کر جناح صاحب کو اطلاع کی۔ جناح صاحب نے اسی روز شام کے پانچ بجے کا وقت گفتگو دیا۔ لہٰذا میں نے واپس آکر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو اطلاع دی۔ حضرتؒ نے اپنے تالیف شدہ دو رسالے طبع کرا کر ہمارے ساتھ کر دیئے تھے کہ ممبران لیگ کو خصوصیت سے اور جو بچیں وہ عوام میں تقسیم کر دینا۔ ان میں سے ایک رسالہ میں حضرت کا مسلم لیگ کے نام تاریخی پیام تھا، جس کی روشنی میں جناح صاحب سے گفتگو کرنا تھی۔ اس لیے میں نے وہ دونوں رسالے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے حوالے کیے اور عرض کیا کہ چونکہ گفتگو آپ کو ہی کرنی ہے۔ لہٰذا ان رسالوں کو ملاحظہ فرما لیں تا کہ گفتگو میں آسانی رہے۔ اس پر مولانا نے گفتگو

سے عذر فرمایا اور فرمایا کہ بھائی ان سے گفتگو تم ہی کرنا۔ مَیں نے عرض کیا کہ اوّل تو آپ حضرتؒ کی طرف سے امیرالوفد ہیں، پھر ہمارے سب کے بزرگ ہیں اور میرے تو اُستاد بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کے سامنے ہمارا کسی کا بھی گفتگو کرنا اور خاص کر میرا، خلاف قاعدہ ہے اور دوسرے گستاخی بھی ہے۔ مگر مولانا عذر فرماتے رہے۔ بڑی خوشامد کے بعد بارہ بجے وہ گفتگو کے لیے راضی ہوئے۔ اور میں دونوں رسالے ان کی خدمت میں پیش کر کے بے فکر ہو گیا۔

شام کو ساڑھے چار بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ ٹھیک پانچ بجے ہم نے جناح صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ انہوں نے فوراً بلا لیا۔ جناح صاحب کے کمرہ میں پہنچنے کے لیے کچھ سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ عجیب سے مجھے نمونیہ ہوا تھا، چلنے سے یا سیڑھی پر چڑھنے سے اب تک بھی میرا سانس پھول جاتا تھا۔ جس سے فوراً گفتگو کرنا بھی مشکل ہوتا۔ جب نصف سیڑھیاں طے کر لیں اور میرا سانس کافی پھول رہا تھا، تو اس وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ بھیا! تو گفتگو کریا۔ کہ مَیں تو گفتگو نہ کروں گا۔ اب ادھر تو یہ جلدی کہ جناح صاحب ہمارے منتظر بیٹھے ہیں اور ادھر میرے اوپر یہ بم گرا۔ مَیں نے ہر چند عرض کیا کہ حضرت میری حالت تو دیکھیے۔ میں گفتگو کے قابل کہاں ہوں۔ پھر نہ گفتگو کا اسلوب سوچا نہ کچھ۔ آخر میں کیسے گفتگو کر سکتا ہوں۔ لیکن مولانا نے نہ مانا۔ آخر طوعاً و کرہاً میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا یوں ہی سہی۔

قائد اعظم سے وفد کی پہلی ملاقات

چنانچہ ہم سب اوپر پہنچے۔ جناح صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ہم کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب سے مصافحہ فرمایا۔ عبدالعزیز صاحب بیرسٹر بیٹھے تھے، جن کے جناح صاحب مہمان تھے ہمارا سب کا تعارف کرایا۔ سب بیٹھ گئے اور گفتگو شروع ہو گئی جو مَیں

نے حضرت کی ہدایات کے مطابق کی۔ یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ جناح صاحب نے نہ یہ کہ جوابات تسلّی بخش عنایت فرمائے، بلکہ ان کے جوابات ایسے تھے کہ ہم سب اور خصوصیت سے میں تو بہت متاثر ہوا۔ کیونکہ اگر دوران گفتگو میں ان کے کسی دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا، تو بغیر کسی تاویل یا حجت کے انہوں نے اپنی کوتاہی کو تسلیم کیا اور آئندہ اس عمل کی اصلاح کا وعدہ کیا اور ہم سے کہا کہ آپ بھی دُعا کریں کہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہم سب تو جناح صاحب کو کیا متاثر کر سکتے تھے اور میری تو خصوصیت سے کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ نہ دینی نہ دنیوی۔ یہ صرف حضرت کا وہ رُوحانی فیض کام کر رہا تھا، جو حضرت کی توجہ سے پہنچ رہا تھا اور جناح صاحب بھی حضرت کے فرستادہ وفد سے متاثر تھے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ جناح صاحب کسی بڑے سے بڑے کا اثر بھی قبول کرنے والے نہ تھے"۔

تبلیغ نماز

اس ایک گھنٹہ کی گفتگو میں بہت سے مذہبی امور زیر بحث آئے جن میں سے ایک امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے قائداعظم کے حالات و خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اپنی اس اولین ملاقات کی تفصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" بدوران گفتگو میں نے جناح صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ ہزاروں روپیہ خرچ کرا کے پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔ اس میں کیا نفع ہے ؛ جناح صاحب نے فرمایا کہ اس سے غیر اقوام پر رعب پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک اور تدبیر بتا دوں، جس سے رعب زیادہ ہوگا۔ فرمایا کہ وہ کیا ؟ میں نے کہا کہ جب دوران جلسہ میں نماز کا وقت آجائے تو اس سوا ڈیڑھ لاکھ کے مجمع

کو لے کر با جماعت نماز ادا کریں۔ پھر آپ خود دیکھیں گے کہ کتنا رعب پڑتا ہے۔ اس پر جناح صاحب نے فوراً فرمایا کہ آپ فرماتے تو صحیح ہیں مگر میں اس وقت اس پر عمل کرنے سے معذور ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیا عذر ہے؟ تو فرمایا کہ آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں، تو امام کس کو بناؤں۔ ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں سب لوگ نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز پڑھ لے۔ مگر میں امامت کے قابل نہیں۔ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں۔ اس لیے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیوبندی ہوگا تو بریلوی اس کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے۔ اگر بریلوی ہوگا تو دیوبندی نہ پڑھیں گے اور الگ جماعتوں سے بجائے رعب پڑنے کے غیر اقوام کو مسلمانوں کا اختلاف نمایاں ہوگا۔ اب تو اپنی اپنی مسجدوں میں پڑھتے ہیں اور یہاں اکٹھی جماعتیں ہوئیں تو یہ زیادہ نمایاں ہوگا۔ اس لیے میں اس وقت تو معذور ہوں، آگے چل کر دیکھا جائیگا۔

میں نے کہا کہ اس پر تو بحث طویل ہو جائے گی کہ یہ عذر صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق تو پھر کسی ملاقات میں عرض کروں گا۔ اب دوسری بات عرض کرتا ہوں کہ خود آپ پر تو نماز فرض ہے آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ جلسوں میں اپنا یہ معمول رکھیں کہ جب نماز کا وقت آوے، مصلّیٰ بچھا کر آپ نیت باندھ لیں اور کوئی پڑھے نہ پڑھے۔

یہاں تک تو میں نے جناح صاحب کی گفتگو نقل کی ہے۔ الفاظ میرے ہیں بات اُن کی ہے۔ آگے مندرجہ بالا سوال کا جو جواب جناح صاحب نے دیا۔ اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ جن کو سن کر مجھے تو پسینہ آگیا تھا۔ کہ ایک بے عمل مگر اتنا بڑا آدمی یوں مجمع کے سامنے اقرارِ خطا کرے بڑی بات ہے۔ ہم جیسوں سے اس قسم کا سوال ہوتا تو شاید تاویل ہی کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت

کرے (آمین) کہ وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے ۔ میری بات سن کر وہ آگے کو جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجہ میں یہ الفاظ فرمائے :۔

"میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں ۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں ۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کرونگا"۔

چونکہ اس کمرہ میں ہمارے (ارکانِ وفد کے) علاوہ بارہ تیرہ اور حضرات بھی موجود تھے ۔ جن میں سے مولوی منفعت علی صاحب وکیل سہارنپوری، مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ، مسٹر عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ کو جانتا تھا ۔ باقی حضرات سے میں واقف نہ تھا سان سب کے سامنے ان الفاظ سے بغیر کسی تاویل کے اظہار ندامت اور اقرارِ اصلاح نے مجھے بہت متاثر کیا ۔ اس تاویل سے فوراً سنبھل کر میں نے کہا کہ دیکھئے ! یہ وعدہ جناح صاحب کا ہے، کسی چلتے پھرتے آدمی کا نہیں ۔ اس وعدہ کو پورا فرمایا جاوے۔

اس پر مرحوم سیدھے ہو کر تن گئے اور بار بار سینہ پہ ہاتھ مار کر فرمایا کہ :۔

"جناح کا وعدہ ! جناح کا وعدہ !! میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کرونگا آپ میرے لیے دعا کریں"۔ (مشاہدات و واردات ص۱۱۴ تا ص۱۱۸)

دعائے درویش

تبلیغ کے فریضہ سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے روز اس وفد نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دربارِ اشرفیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی ۔ اس میں حضرت تھانوی کا تاریخی بیان پڑھا گیا اور اس کی مطبوعہ کاپیاں عوام و خواص میں تقسیم کی گئیں ۔ جس کے ذریعہ ارباب و ارکان مسلم لیگ کو نماز روزہ، تمام دینی شعائر اور وضع اسلامی کی پابندی کی تلقین کی گئی ۔ اس سے اگلے روز یہ وفد واپس ہوا اور اپنی پہلی کامیابی کی رپورٹ دربارِ اشرفیہ میں پیش کی ۔

حضرت تھانویؒ نے جب یہ حالات سنے، تو بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا۔ سب سن کر تو یہی، اصلاح کے لیے اور بالخصوص مسٹر جناح کے لیے دعا فرمائی۔

قائداعظم سے وفد کی دوسری ملاقات

اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے قائداعظم کے قول و کردار کا گہرا نظر سے مطالعہ شروع کر دیا۔ آپ ان میں جب بھی کوئی بات خلافِ شریعت دیکھتے اس کی اصلاح کے لیے قائداعظم کے پاس فوراً وفد یا خط بھیجتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے بعد قائداعظم نے جو تقاریر کیں ان سے مذہب اور سیاست کے متعلق ان کا نظریہ واضح ہو گیا کہ وہ اہلِ مغرب کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں اور الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے مولانا شبیر علی صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ:۔

"جناح صاحب کی تقریروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ اس کی بابت ان کو سمجھانا ہے۔" (روئیداد تبلیغ ص۶)

چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ ان کی درخواست پر حضرت نے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) کو ان کے ساتھ کر دیا۔ تین حضرات کا یہ وفد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی پہنچا۔ مولانا شبیر علی صاحب نے قائداعظم سے ٹیلیفون پر اپنا تعارف کرایا کہ:۔

"ہم وہی ہیں، جو پٹنہ میں نیاز حاصل کر چکے ہیں۔ اب بھی ہم کو وقت دیا جائے۔"

قائداعظم نے انہیں شام کے سات بجے کا وقت دیا اور یہ سب حضرات ٹھیک وقت

مقررہ پر ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی آمد کے مقصد سے انہیں آگاہ کیا :۔

مذہب و سیاست پر بحث

چنانچہ مذہب و سیاست پر افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری ہو گیا ۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ :۔

وفد نے قائداعظم سے کہا کہ مسلمان تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکام اسلام کا نمونہ نہ بنائیں ۔ اور ان کے پیرو شعائر اسلام کی پابندی نہ کریں ۔ کیونکہ جب یہ سب خود کو احکام دین کا پابند بنالیں گے، تو اس کی برکت سے نصرت و کامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور انشاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہو گی ۔

وفد نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی ۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل بھی ۔ خلفائے راشدین حضرت خالد بن ولیدؓ ۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراحؓ ۔ حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ سب مذہب و سیاست کے جامع تھے ۔

قائداعظم نے فرمایا کہ میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیے ۔ وفد نے کہا کہ پھر اس طرح کامیابی کی توقع نہیں"۔

غرضیکہ اس موضوع پر پورے اڑھائی گھنٹے گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر یہ خانقاہ نشین علماء

دنیا کے اس بہت بڑے اور کامیاب سیاستدان کی سیاست کو مذہب کی حدود کے اندر لانے میں کامیاب ہو گئے اور قائد اعظم نے وفد کی معروضات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنے اس تاریخی فیصلہ سے آگاہ فرمایا کہ :-

"دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو، میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع رہے"۔ (روئیداد ص۷)

تبلیغی ملاقاتوں کا سلسلہ

اسی طرح دربار اشرفیہ کے مبلغین اور قائد اعظم کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا جب بھی کسی دینی معاملہ میں حضرت تھانوی قائد اعظم کی رہنمائی ضروری سمجھتے، فوراً ان کی خدمت میں اپنا سفیر بھیجتے۔ دہلی کی دوسری ملاقات میں مولانا شبیر علی صاحب اپنے ساتھ پھر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو ہمراہ لے گئے۔ مگر تیسری ملاقات کے وقت مفتی صاحب کو بھی کوئی عذر پیش آگیا جس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شبیر علی صاحب سے فرمایا کہ :-

"تم ہر مرتبہ کسی نہ کسی کو ساتھ لے جانے کی کیوں کوشش کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ معاملہ تبلیغ احکام کا ہے۔ مجھے اپنے اوپر اطمینان نہیں۔ میں ساتھیوں سے کہہ دیتا ہوں کہ گفتگو تو میں ہی کروں گا۔ اگر دوران گفتگو میں میری زبان سے کوئی غلط بات نکلے تو بلا لحاظ اس کے کہ میری کچھ ہتک جناح صاحب کے سامنے ہوگی، مجھے فوراً متنبہ فرمادیں۔ اس میں وہ حضرات تو بالکل خاموش تشریف رکھتے ہیں، مگر مجھے اطمینان رہتا

ہے کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو ساتھی متنبہ فرما دیں گے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اجی نہیں! اس کی فکر مت کرو۔ ہر مرتبہ ساتھی کی تلاش میں دقّت ہوتی ہے۔ اللہ کا نام لے کر جاؤ، اللہ مددگار ہے۔" (روئیداد ص)

سفیرِ اشرف چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ دربارِ اشرفیہ کی طرف سے مولانا شبیر علی صاحب ہی اکیلے بطور سفیر تبلیغ قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ مولانا کے لیے قائدِ اعظم نے ملاقات کا وقت اور مقام مستقل طور پر مقرر کر رکھا تھا۔ مولانا جب بھی دہلی جاتے اور ملاقات کے لیے ٹیلیفون کرتے، خواہ اس وقت کتنے ہی کیوں نہ بجے ہوں انہیں شام کے سات بجے کا ہی وقت بغرضِ ملاقات دیا جاتا۔ پٹنہ کی ملاقات کے بعد مولانا موصوف نے قائدِ اعظم کے ساتھ جس قدر ملاقاتیں کیں، سب کی سب اسی وقت ہوئیں اور کوئی ملاقات اڑھائی گھنٹہ سے کم اور تین گھنٹہ سے زائد عرصہ تک نہیں رہی۔ مولانا بھی ماشاء اللہ اصولوں کے بادشاہ کے سفیر تھے اور بذاتہٖ بھی بڑے با اصول! اس لئے وہ ٹھیک سات بجے ہی اپنے مخصوص کمرۂ ملاقات میں قدم رکھتے، جو قائدِ اعظم کی کوٹھی کے برآمدہ کے سرے پر واقع تھا۔ دوسرے ملاقاتیوں سے تو قائدِ اعظم ڈرائینگ روم میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ مگر سفیرِ اشرفیہ کے لیے ایک خاص امتیاز و اعزاز کے لیے یہ آراستہ کمرہ مخصوص تھا جس میں اور کسی کو شرفِ ملاقات نہ بخشا جاتا تھا۔ اگر اتفاق سے مولانا چند منٹ پہلے پہنچ جاتے، تو اتنا عرصہ کوٹھی کے باہر ہی ٹہل کر گذار لیتے کوٹھی کے اندر وقت مقررہ سے پہلے قدم نہ رکھتے اور قائدِ اعظم جو ان کی انتظار میں تیار بیٹھے ہوتے مولانا کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی فوراً بعد پہنچ جاتے۔

اعترافِ قائدِ اعظم حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو کبھی سیاسیات

پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کیونکہ سیاسیات کے تو وہ خود ماہر تھے۔ البتہ جو کمی تھی، وہ صرف تدین کی تھی۔ جسے پیدا کرنے کے لیے تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری کیا گیا تھا اس لیے مولانا نے قائداعظم سے جس قدر ملاقاتیں کیں، سب میں مذہبی امور ہی زیرِ بحث لائے اور سیاسیات پر کبھی گفتگو نہ فرمائی۔ چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب اپنی رودیداد میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک مرتبہ میں حسبِ ارشاد حضرتِ والا حاضر ہوا۔ وہی شام کے سات بجے تھے ابھی جانبین سے مزاج پرسی ہی ہو رہی تھی کہ موٹر کی باہر سے آواز آئی اور ملازم نے آکر اطلاع دی کہ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں تو یہ سمجھا کہ آج کی مجلس ختم ہوئی۔ اب کوئی اور وقت لے لوں گا۔ مگر جناح صاحب نے پیشانی پر بل سا ڈال کر ملازم سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو بٹھا دو اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ جی فرمائیے! میں نے جو کچھ عرض کرنا تھا، شروع کر دیا اور جناح صاحب نے اس پر بحث شروع فرما دی۔ یہ محض حضرت کی توجہ کا اثر تھا کہ مجھ جیسا بے بضاعت آدمی ان کی بحث کا تسلی بخش اور ان کے فہم کے مطابق جواب عرض کر سکتا تھا۔ یہ بحث بھی ان ہی الفاظ پر ختم ہوئی کہ:۔

"ہاں میری غلطی تھی۔ اب میری سمجھ میں آگیا"۔

رات کے دس بجے یہ مجلس ختم ہوئی میں اجازت لے کر کھڑا ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ کا وقت تو ہمیشہ لیتا رہتا ہوں۔ مگر آج میری وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو انتظار کی بہت تکلیف ہوئی۔ اس پر قائداعظم نے فرمایا کہ:۔

"نہ نہ! آپ اس کا ہرگز خیال نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب سے ہر وقت

بات ہوتی رہتی ہے۔ اور اس وقت بھی وہ جس کام کے لیے آئے ہیں، مجھے معلوم ہے۔ مگر آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں اور حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں۔ علماء میرے پاس بہت آئے مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں اور میں مذہب سے ناواقف ہوں۔ حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لیے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔"

میں نے عرض کیا کہ آج تو مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر چکا۔ آپ کے اس دینی شوق میں اللہ تعالیٰ ترقی دے۔ اب پھر جب حضرت کا حکم ہوگا حاضر ہوں گا۔ فرمایا کہ اچھا یہ آپ کی مرضی اور میں چلا آیا۔"

(روئیداد ص ۸۹)

اعتمادِ قائداعظم

مولانا موصوف اور قائداعظم کی گفتگو نہایت بے تکلفانہ ماحول میں ہوتی اور کبھی موقع پیدا ہوتا تو ایک دوسرے سے مزاح لطیف کا تبادلہ بھی کر لیتے۔ جیسا کہ مولانا کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ:۔

"ایک روز دورانِ گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ جناح صاحب! ہم انگریزی سیاست سے ناواقف ہیں۔ اس لیے ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں۔ آپ انگریز کے تھپڑ مارنے کو کہتے ہیں ہم تھپڑ مارتے ہیں۔ آپ گھونسہ مارنے کو کہتے ہیں ہم گھونسہ مار دیتے ہیں۔ غرض اس معاملہ میں ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں اور جتنے ہم سیاست سے ناواقف ہیں، شاید اس سے کچھ زیادہ یا اتنے ہی آپ مذہب سے ناواقف ہیں۔ تو جس طرح ہم آپ کی تقلید کرتے

ہیں، مذہبی معاملات میں آپ کو بھی ہماری تقلید کرنا چاہیے ۔ اس پر فرمایا کہ اس وقت دنیا میں کتنے لیڈر ہیں ۔ مَیں نے عرض کیا کہ جتنے برسات میں مینڈک ، قائداعظم بہت ہنسے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے ۔ پھر فرمایا کہ کیا آپ ہر لیڈر کا کہا مانتے ہیں ؟ مَیں نے کہا نہیں ! ایسی تقلید میں اعتماد شرط ہے ۔ فرمایا :۔

"بس ! اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ مَیں بے چون وچرا آپ کا کہا مانوں تو مَیں تیار ہوں ۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لیے بحث بھی کیا کرتا تھا لیکن آج کے بعد مَیں خاموش بیٹھ کر سنوں گا اور مذہبی معاملات میں جو ہدایات آپ دیں گے ، اُن کو تسلیم کروں گا ۔ کیونکہ مجھے حضرت تھانوی پر پورا پورا اعتماد ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے ۔"

مَیں نے عرض کیا کہ جزاکم اللہ ! میرا مقصد بھی حضرت ہی کی رائے ماننے سے ہے ۔ لیکن آپ بحث ضرور کر لیا کریں کہ اس طرح بات سمجھ میں آنے کے بعد پختہ ہو جاتی ہے ۔ مگر یہ ممکن ہے کہ میری کوتاہی تقریر سے کسی وقت کوئی بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اور اس وقت میں یہ عرض کروں کہ اگرچہ میں آپ کو سمجھا نہیں سکا ، لیکن مسئلہ یہی ہے ۔ تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا ۔ یہ سن کر فرمایا کہ " ضرور ایسا ہی ہوگا " (روئیداد ص ۱۰-۹)

قائداعظم سے مکاتبت

قائداعظم کی خدمت میں تبلیغی وفود بھیجنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت تھانوی انہیں تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہے ۔ چنانچہ " اعلام نافع " میں درج ہے کہ :۔

" میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں چنانچہ

عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں ! ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کے لیے بھیجا - پھر ۱۲ر فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اسی کام کے لیے دہلی روانہ کیا - غرض جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے - لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں - اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے اور ان کو نماز، روزہ، وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے، تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہوجاتی ''۔ (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ صہ ۸۶)

علاوہ ازیں '' افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ '' صہ ۹۶ پر حضرت تھانوی کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے - آپ نے فرمایا کہ :-

'' جس زمانہ میں کانگریس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی - میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امورِ دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے - اس لیے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں - بلکہ علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمادیں - تو انہوں نے نہایت شرافت اور تہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اسی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا ''۔

قائداعظم چونکہ فطرتِ سلیم کے مالک تھے اور حضرت تھانوی کی تبلیغ سے بہت زیادہ متاثر تھے - اس لیے وہ حضرت کی ہدایات کو بڑی مسرت کے ساتھ قبول فرماتے تھے - چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی موجودگی میں قائداعظم کا ایک گرامی نامہ انگریزی میں آیا -

اس میں درج تھا کہ :-

"آپ کا والا نامہ ملا - بڑی مسرت ہوئی - اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا - آئندہ بھی آپ مجھے ہدایت فرماتے رہیں"

حضرت تھانوی کے خطوط تو اُردو میں ہوتے تھے، مگر خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ان کا انگریزی ترجمہ کر کے اصل خط کے ساتھ منسلک کر دیتے تھے، تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو اور اس تمام خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی محفوظ رکھتے تھے -

اشاعتِ مکاتبت کی سعی

۱۹۴۷ء میں جب کہ راقم حضرت تھانوی کی یادگار میں رسالہ "پیغام اسلام" شائع کرنیوالا تھا - راقم نے مولانا شبیر علی صاحب سے اس تاریخی خط و کتابت کا بغرض اشاعت مطالبہ کیا - تو انہوں نے لکھا کہ یہ خط و کتابت جانبین کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کی جاسکتی حضرتؒ تو موجود نہیں، مگر قائد اعظم کی اجازت لینی ضروری ہے - ان سے اجازت لینے کے بعد ہی اس کی اشاعت کی اجازت دی جا سکتی ہے - چنانچہ انہیں ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو بذریعہ چٹھی نمبر ۱۰۵ قائد اعظم سے اجازت حاصل کرنے کے لیے لکھا گیا تو انہوں نے جواباً لکھا کہ :-

"مخدومی ! السلام علیکم !

میرا قصد وسط مئی میں دہلی جا کر قائد اعظم سے ملنے کا ہے - انشاء اللہ خطوط کی نسبت اسی وقت ان سے دریافت کر لوں گا - اگر ممکن ہو تو ایک خط بطور یاد دہانی ایسے

وقت روانہ فرمادیں کہ مجھے ۱۲ یا ۱۳ مئی کو مل جائے تاکہ یاد تازہ ہوجائے۔

والسلام　　　　احقر شبیر علی از تھانہ بھون"

بعدازاں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کو یاد دہانی نہ کرائی جاسکی۔ پاکستان بن گیا۔ قائداعظم فردوسِ بریں کو سدھار گئے۔ مولانا شبیر علی صاحب بھی ہجرت کرکے پاکستان تشریف لے آئے۔ اس وقت دوبارہ انہیں اس خط وکتابت کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کیونکہ اب کسی کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ مگر بدقسمتی سے وہ یہ خط وکتابت ہندوستان میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ جس کے منگانے کے لیے ایک ترکیب نکالی گئی اور مولانا شبیر علی صاحب نے تھانہ بھون لکھ دیا اور احتیاطاً یہ مشورہ دیا کہ :۔

قائداعظم کی فائل

"میں نے آج تھانہ بھون خط لکھ دیا ہے۔ اگر وہ خطوط محفوظ ہوئے تو آجاویں گے۔ حضرت کی وفات کے بعد بمبئی سے پانچ حضرات[1] بطور تعزیت تھانہ بھون آئے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا تھا کہ ہم لوگ کچھ تبلیغ کے سلسلہ میں قائداعظم صاحب کے پاس گئے تھے۔ دورانِ گفتگو میں قائداعظم نے بڑے جوش سے فرمایا کہ اس قریب زمانہ میں ہندوستان میں سب سے بڑا عالم کون گزرا ہے؟ یہ پانچوں حضرات کہنے لگے کہ ہمارے ذہن میں حضرتؒ تھے، مگر ہم نے سوچا کہ نہ معلوم ان کے ذہن میں کون ہے۔ اس لیے ہم نے قائداعظم سے ہی دریافت کیا کہ آپ ہی بتائیے؛ اس پر قائداعظم اٹھ کر دوسرے کمرہ میں گئے اور ایک فائل لاکر کھول کر دکھلایا کہ آپ لوگ پہچانتے ہیں کہ یہ تحریر کس کی ہے؟ ہم سب نے حضرتؒ کی تحریر پہچان کر کہا کہ یہ تحریر

[1] یہ حضرات مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے ممبر تھے۔ جو حضرت کی تحریک پر اربابِ مسلم لیگ کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً تبلیغ کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔

تو حضرت تھانوی کی ہے۔ اس پر قائدِ اعظم نے بڑے جوش سے کہا کہ ہاں! اور یہی شخص اس زمانہ کا سب سے بڑا عالم گزرا ہے اور بہت سے کلمات حضرت کی تعریف میں کہے۔ اس قصہ کو نقل کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ شاید وہ فائل فاطمہ جناح کے پاس ہو۔ اگر کوئی سبیل ہو، تو ان سے بھی تحقیق کر لی جاوے۔ تھانہ بھون سے خطوط آگئے، تو میں پیش کر دوں گا۔" (مکتوب گرامی مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۴ء)

چنانچہ اس سلسلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کو ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء اور دوبارہ بطور یاد دہانی ۲۳ فروری ۱۹۵۵ء کو دو انگریزی ٹائپ شدہ چٹھیاں بذریعہ رجسٹری بواپسی رسید لکھی گئیں۔ جن کی خود فاطمہ جناح کی قلمی رسید وصولی موجود ہے۔ مگر انہوں نے ان کا جواب تک نہ دیا۔ حالانکہ ان کے برادرِ مکرم قائدِ اعظم بقول حضرت تھانوی خطوط کا جواب بہت جلد دیتے تھے۔

ادھر تھانہ بھون سے بھی خطوط کے بارہ میں جو جواب آیا، اس کے متعلق مولانا شبیر علی صاحب نے یوں مطلع فرمایا کہ:۔

"قائدِ اعظم کے خطوط کی بابت ہندوستان سے مایوس کن جواب آیا ہے جس کی تفصیل معلوم کر کے میری طرح آپ کو بھی صدمہ ہوگا۔ اس لیے صرف یہی اطلاع کافی ہے"۔

تصدیقِ صدیق

باغپت ضلع میرٹھ کے رئیس اعظم نواب جمشید علی خاں صاحب بڑے صاحبِ علم و ذوق بزرگ ہیں۔ اپنے علاقہ میں اپنے اخلاص و ایثار کی وجہ سے اتنے ہر دلعزیز کہ متواتر تیس برس یو۔ پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے حضرت تھانوی کے مریدان خاص میں سے ہیں۔ حضرت تھانوی کو نواب صاحب

سے کتنی محبت تھی - اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ نواب صاحب جب پہلی مرتبہ دربارِ اشرفیہ میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے اپنی تسلّی کیلئے حضرت پر بہت سے سوالات کیے جن کے جوابات نے نواب صاحب کو حضرت کے حلقۂ مریدین میں شمولیّت پر مجبور کر دیا۔ وہ سوالات چونکہ بہت اہم نوعیت کے تھے، اس لیے جناب دقیل بلگرامیؒ کے جوابات قلمبند کرتے گئے۔ تو آپ نے اس مجموعہ ملفوظات کا نام غایت شفقت سے نواب صاحب کے نام کی رعایت سے "بزمِ جمشید" رکھا جو یہ مجموعہ کئی بار چھپ چکا ہے -

نواب صاحب موصوف کے صدق و اخلاص سے قائدِ اعظم بڑے متاثر تھے - وہ انہیں "یارِ غار" تصور کرتے تھے اور عموماً موسم سرما میں اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ آرام کرنے کے لیے نواب صاحب کے ہاں باغپت تشریف لے جایا کرتے تھے اور ہفتوں وہاں رہتے تھے - وہاں اکثر حضرت تھانوی کا ذکر ہوتا رہتا تھا - نواب صاحب انہیں حضرت کے ملفوظات وغیرہ بھی سنایا کرتے تھے، جن میں قائدِ اعظم بڑی دلچسپی لیتے تھے اور حضرت کے متعلق ان کے دل میں غائبانہ محبت و عظمت پیدا ہوگئی تھی -

مولانا شبّیر علی صاحب بطور سفیر دربارِ اشرفیہ قائدِ اعظم کو جو تبلیغ کرتے رہے - اُس کے متعلق نواب صاحب اپنے مکتوب مورخہ ۴ اپریل ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ :-

جامِ جمشید "یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائدِ اعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانویؒ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا ۔ مولوی شبّیر علی صاحب تھانوی نے قائدِ اعظم کو حضرت والا کے قریب تر لانے میں بڑا کام کیا -

ایک مرتبہ قائدِ اعظم کے ایما سے نواب اسماعیل خاںؒ[1] صاحب میرے ساتھ حضرت

---

[1] دہلی کے مشہور رئیس نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کے پوتے، بیرسٹر، ایم، ایل، اے صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو، پی -

تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند اہم سیاسی مسائل پر گفتگو کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی شفقت سے تمام گفتگو سماعت فرمائی اور ہر سوال کا ایسا مکمل جواب مرحمت فرمایا کہ نواب اسماعیل خاں صاحب انگشت بدنداں تھے۔ کہنے لگے کہ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ بوریا نشین نہایت خاموش زندگی بسر کرنے کے باوجود سیاسیات میں ایسی بصیرت رکھتے ہیں اور ہر مسئلہ پر کس قدر عبور ہے۔ یہ ملاقات نواب اسماعیل خانصاحب کی خواہش پر حضرت والا سے میں نے ہی طے کرائی تھی۔ نواب صاحب آج تک بطور اظہار تشکر فرمایا کرتے ہیں کہ تیری بدولت مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی۔

قائداعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

قائداعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہی جوتیوں کا صدقہ تھا۔

میرے ایک ملازم جن کا نام حاجی بندو ہے، مجھے بہت عزیز ہیں۔ دو تین پشتوں سے ان کا میرے خاندان سے تعلق ہے۔ حضرت کے بھی بہت محبوب مرید ہیں۔ میاں بندو ان خوش نصیبوں میں سے ہیں، جن کو آخری لمحات تک حضرت والا کی خدمت کا موقع نصیب ہوا۔ حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا نے مجھے لکھا تھا کہ اگر ممکن ہو، تو حاجی بندو کو بیماری کے زمانہ میں حضرت والا کی خدمت کے لیے تھانہ بھون بھیج دیا جائے۔

ایک خط میاں بندو کے پاس محفوظ تھا، جس کی نقل اور حاشیہ پر حضرت والاؒ نے جو جواب تحریر فرمایا ہے، اُس کی نقل روانہ کرتا ہوں۔ یہ خط اس موضوع سے بہت

متعلق ہے، جو زیرِ تحریر ہے۔ نیاز مند جمشید!"

مقامِ حاجی بندو نواب صاحب موصوف کے خادمِ خاص حاجی بندو صاحب اُن خوش نصیب خدام میں سے ہیں، جو ایک طرف تو اپنے آقا کو "بہت عزیز" ہیں اور دوسری طرف اپنے آقا کے شیخ حضرت تھانوی کو "بہت محبوب" ہیں۔ گویا کہ وہ نواب صاحب کے خادم خاص ہی نہیں، اُن کے پیر بھائی بھی ہیں۔ جن کا ذکرِ خیر مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنی کتاب "یادِ رفتگاں" میں اُن حسرت بھرے الفاظ میں کرتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ کے آخری ایام میں :-

"خدمت اور خاص کر رات کے وقت نوبت بر نوبت جاگ کر خدمت کی سعادت خدامِ خاص کی قسمت میں آئی۔ جن میں پہلا درجہ خواجہ (عزیز الحسن) صاحب کا ہے ان کے علاوہ مولانا جلیل احمد صاحب، بندو میاں ملازم نواب صاحب بائیپت اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمتِ خاص کی سعادت آخیر تک پائی۔ بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب بھی ڈھاکہ سے آ کر اس میں شامل ہو گئے۔" (یادِ رفتگاں ص۲۹۱)

قائداعظم اور حاجی بندو یہ حاجی بندو صاحب، ۲۰ اپریل ۱۹۴۳ء کو قائداعظم کے متعلق حسب ذیل خط حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھتے ہیں :-

"از جانب بندو باخیلتی!

حضور اقدس مدظلہ العالی

السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہٗ!

غلام حضور والا کی خیریت چاہتا ہے۔ بڑی پیرانی صاحبہ اور چھوٹی پیرانی صاحبہ

کی بھی خیریت چاہتا ہے۔ جناب قائدِ اعظم محمد علی جناح معہ اپنی ہمشیرہ کے باغپت نواب صاحب کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ چار روز قیام رہا۔ چلتے وقت مجھے بلایا اور کہا کہ خدا نے مجھے بہت دے رکھا ہے۔ میں تمہارے بال بچوں کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ فقط محمد علی جناح ہوتے، تو میں لے لیتا۔ مگر آپ تو ہمارے قائدِ اعظم ہیں، اس لیے معافی چاہتا ہوں۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے قائدِ اعظم کو کچھ نذر پیش کر دوں، لیکن اتنی وسعت نہیں ہے۔

حضرت والا کے غلام کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت والا غلام کے پاس ہیں۔ میرے دل سے جو آواز نکل رہی تھی۔ غلام کو یقین ہے کہ حضرت والا ہی بول رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی ادب سے نیچے نظر کیے ہوئے میری بات سن رہے تھے۔ یہ حضرت والا کا ہی ادب تھا۔ میں نے کہا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ میں حضرت والا سے آپ کی تعریف کروں گا۔ کہنے لگے، مولانا تھانوی سے؟ میں نے کہا، جی ہاں! فرمانے لگے کہ تمہارے اندر مسلمانوں کا درد ہے۔ چار دن جو تم نے ہماری خدمت کی، اس سے اندازہ ہو گیا، ابھی وقت نواب صاحب تشریف لے آئے۔ نواب صاحب سے بہت دیر تک کمرہ میں باتیں کرتے رہے۔

موٹر میں سوار ہونے سے پہلے میرے پاس آئے۔ کہا السلام علیکم اور مصافحہ کیا اور دہلی چلے گئے۔ نواب صاحب فرمانے لگے کہ جب قائدِ اعظم نے تمہاری تقریر کو مجھے دہرایا تو ہم تینوں یعنی قائدِ اعظم، فاطمہ جناح اور میں آنسوؤں سے رونے لگے۔ نواب صاحب نے کہا کہ چلتے وقت جناح صاحب مجھے یہ کہہ گئے کہ اسمبلی کے اجلاس کے بعد میری وائسرائے سے ملاقات ہو گی تو میں اُن سے کہوں گا کہ مسلم لیگ کی جڑیں اب

پہنچ گئی ہیں۔
حضرت والا نے اس ناچیز غلام کی تمام طمع کی جڑیں کھرچ کر صاف کر دی ہیں اور
ایسا غنی کر دیا ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو دل نہیں چاہتا بلکہ خیال تک بھی
نہ تا۔ نواب صاحب نے میری بہت تعریف کی۔ یہ سب حضرت والا کی برکت
غلام حضرت والا سے دعا چاہتا ہے۔ زیادہ حد ادب والسلام!

خادم بندہ باغپتی، ۲۰ اپریل ۱۹۴۳ء

اس خط کے حاشیہ پر حضرت تھانوی کے قلم حقیقت رقم سے یہ جواب تحریر ہے:۔
"السلام علیکم! شاباش ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ اللہ
تعالیٰ اس دولت میں اور ترقی دے۔ میں اس قدر مسرور ہوا کہ کوئی مضمون
بھی ذہن میں نہیں آتا۔"

[قائد] اعظم کا خراجِ تحسین

مذکورہ بالا خطوط سے نہ صرف حضرت تھانویؒ کی تبلیغی مساعی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ ان سے [یہ بھی] ظاہر ہے کہ قائداعظم کے دل میں حضرت تھانوی کی کتنی عزت و عظمت تھی۔ [حقیق]ت یہ ہے کہ قائداعظم کی نظر میں حضرت تھانوی کے بعد کوئی عالم جچتا ہی نہ تھا [چنانچہ] کہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ بمبئی میں جمعیتہ علماء اسلام کی
کانفرنس ہوئی جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی میں اور مولانا محمد طاہر
مرحوم وغیرہ شریک ہوئے۔ تو بمبئی کے چند تاجر جن کو حضرتؒ سے تعلق تھا
ہم سے ملے اور بیان کیا کہ قائداعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ

کانگرس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ یہ سن کر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ تم کن کو علماء سمجھتے ہو؟ انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا نام لیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد عالم ہیں، مگر ان کی سیاست ایک ہی ہے کہ انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اس دشمنی میں وہ مسلمانوں کے مفاد کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ مولانا کفایت اللہ صاحب واقعی مفتی ہیں اور کچھ سیاست دان بھی لیکن ابوالکلام نہ عالم ہے، نہ سیاستدان ہے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑا میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے، تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں"۔

تاثراتِ سفیرِ اشرف

قائداعظم سے بار بار ملاقات کرنے والے سفیرِ اشرف شبیر علی صاحب تھانوی ان کے متعلق اپنے مشاہدات و واردات کی بناء پر لکھتے ہیں کہ:۔

"بعض حضرات کو میں نے کہتے سنا ہے کہ جناح صاحب بہت ضدی تھے۔ مگر میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر بالکل وثوق سے کہتا ہوں کہ ضد

ور ہٹ دھرمی آپ کے پڑوس میں بھی نہ رہتی تھی ۔ وہ مشورے کرتے
ہتے تھے ۔ بحث بھی خوب کرتے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں آ
جاتی تھی، تو ہر مرتبہ وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتے تھے کہ "میری غلطی
تھی ' اب میری سمجھ میں آگیا 'آپ صحیح کہتے ہیں "۔ تو بھلا جو شخص مجھ
جیسے شخص کے سامنے غلطی کا اعتراف کرکے بات کو تسلیم کرے 'اُس کو
میں ضدی کیسے سمجھوں ۔ ہاں بعد بحث و تمحیص کے جو بات طے کر لیتے تھے
پھر اس پر پختہ رہتے تھے ڈھل مل یقین نہ تھے ۔ یہ نہ تھا کہ میں گیا تو
میرے ہمنوا ہو گئے اور دوسرا گیا تو اُس کے ہمنوا بن گئے "۔ (روئیداد ص)

تبلیغ قائد اعظم چونکہ ایک سیاسی لیڈر تھے اور ان کی ساری زندگی سیاسی
کشمکش میں گذری تھی ۔ اس لیے ہر ایک کی نظر ان کے سیاسی کارناموں
تک محدود رہی ۔ کسی نے ان کے دینی خیالات اور مذہبی عقائد پر روشنی نہیں ڈالی، جیسے
ان کو دین و مذہب سے کوئی تعلق ہی نہ تھا ۔ بلکہ جب بھی ان کے تدین کا کہیں تذکرہ کیا
گیا بڑے بڑے اربابِ علم و فہم حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے لگے کہ قائد اعظم
اور مذہبی؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ حالانکہ حضرت تھانوی کے تبلیغی مشن نے ان
کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی تھی، مگر کسی نے اس کا تفحص و تتبع نہ کیا ۔

قرآن اور مومن پیشتر اس کے کہ نتائجِ تبلیغ کی تفصیل پیش کی جائے، ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے مومن کے مقام کی نشان
دہی کردی جائے ۔ تاکہ واقعات کے آئینہ میں اور قرآن کی روشنی میں آپ کو قائد اعظم
کے مقام کا اندازہ ہو سکے ۔ قرآن پاک میں مومن کی مختلف مقامات پر یہ تعریف آئی

ہے کہ :-

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ
(الحجرات ۲/۲۶)

وہ ایمان والے لوگ ہیں جو اللہ
اس کے رسول پر ایمان لائے
شک نہیں کیا اور اپنے مال او
سے اللہ کی راہ میں لڑے وہی
ہیں۔

(۲) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَا
نًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ط
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ط اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط (انفال ۱/۹)

وہی ایمان والے ہیں کہ جب ا
آتا ہے، تو ان کے دل ڈر جا
جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ
جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جا
اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل ک
وہ لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں
نے اُن کو جو رزق دیا ہے اُس
خرچ کرتے ہیں ۔ وہی سچے مومن

اور انہی صادق اور سچے مومنوں کو حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں ولی اور متقی قرار د

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (جاثیہ ۲/۲۵) — اللہ پرہیزگاروں کا دوست ہے

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (زمر ۴/۲۴)

سچی بات لے کر آیا اور جس نے اُ
جانا، وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

اور انہی کو اعزاز و اکرام کی بشارت دی :-

(۱) إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (الحجرات ۲/۲۶) — تحقیق اللہ کے ہاں اس کی بڑی عزت ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

(۲) إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۶/۱۶) — بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے (لوگوں کے دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔

(۳) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور ۷/۱۸) — تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور ملک میں حکومت دے گا۔ جیسے اس نے ان سے اگلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔

(۴) أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس ۷/۱۱) — یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۵) إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (النبا ۲/۳۰) — بے شک پرہیزگار لوگ مراد کو پہنچیں گے

(۶) إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص ۴/۲۳) — بالتحقیق پرہیزگاروں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک مومن کی جو شناخت بیان فرمائی ہے اور ں کے لیے جن انعامات و اعزازات کا وعدہ فرمایا ہے۔ آیا قائداعظم میں بھی یہ خوبیاں وجود تھیں یا نہ؟ قائداعظم کو ان انعامات و اعزازات سے نوازا گیا یا نہ؟ ان سوالات جواب آپ کو مندرجہ ذیل واقعات سے ملے گا۔

پابندیٔ نماز

ارکانِ اسلام میں ایمان بالغیب کے بعد سب سے بڑا رکن نماز ہے، جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کے مطابق کفر و ایمان میں امتیاز پیدا کرتی ہے"۔ جس کی اہمیّت کا اندازہ ان امور سے لگایا جا سکتا ہے کہ :۔

۱۔ اس کا قرآن میں ساڑھے سات سو مرتبہ ذکر آیا ہے

۲۔ جو بلا کسی عذر شرعی کے صحت و علالت، جلوت و خلوت، رزم و بزم اور سفر و حضر غرضیکہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔

۳۔ امام اعظم رح کے نزدیک اس کے تارک کے لیے بدنی سزا اور حبس دوام ہے۔ تاوقتیکہ توبہ نہ کرے اور

۴۔ دیگر تین آئمہ کے نزدیک اس کا تارک واجب القتل ہے۔

اسی لیے فاروقِ اعظم رض نے عنانِ خلافت سنبھالتے ہی اپنے تمام گورنروں کو لکھا تھا کہ :۔

ان اهم امركم عندي الصلوٰة فمن ضيعها فهو لما سواها اضيع (موطا)

میرے نزدیک تمہارے سب کاموں سے زیادہ اہم کام نماز کی اقامت و پابندی ہے۔ جس نے اسے ضائع کیا اس نے دوسرے کاموں کو اور بھی زیادہ ضائع کیا۔

اور سفاکِ اعظم حجاج بن یوسف نے فتح کراچی کے مژدہ کے جواب میں محمد بن قاسم کو لکھا تھا کہ :۔

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو۔ تکبیر و قرأت، قیام و قعود، رکوع و سجود میں خدا تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کیا کرو۔ زبان پر ہر وقت

ذکر الٰہی جاری رکھو۔ کسی شخص کو شوکت و قوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسّر نہیں ہوسکتی اگر تم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے، تو یقیناً مظفر و منصور ہو گے۔"

(آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۰۵ جلد اوّل)

چنانچہ مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی نے اپنے تبلیغی وفد کے ذریعہ قائد اعظم کی توجہ سب سے پہلے نماز کی طرف مبذول کرائی اور انہوں نے بکمال ندامت نماز نہ پڑھنے کے گناہ کا ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اقرار کرتے ہوئے نماز پڑھنے کا وعدہ فرمایا اور بعد ازاں تادم آخر پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے رہے۔

اتباعِ سنت

قائد اعظم گو خاندانی شیعہ تھے، مگر چونکہ ان کی دینی تربیت حکیم الامت حضرت تھانوی کے ذریعہ ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے خود کو کتاب و سنت کا متبع بنا لیا اور شیعہ کہلانا پسند نہ کیا۔ چنانچہ جب کوئٹہ میں انہیں شیعہ وفد ملا اور اس نے اپنا استحقاق ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا کہ آپ ہمارے فرقہ میں سے ہیں" تو قائد اعظم نے پوری جرأت سے فرمایا:۔

"NO I AM MUSLIM"

وہ فرقہ وارانہ امتیاز کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اینگلو عربک کالج ہال دہلی میں مسلم خواتین و طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں فرمایا تھا کہ:۔

"اب مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں۔ وہ شیعہ سنی اور وہابی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیں۔

(نوائے وقت لاہور ۷ ر نومبر ۱۹۴۶ء)

اس پر وہ خود بھی عامل رہے اور ہمیشہ نماز اپنے آبائی طریق کی بجائے مسنون طریقہ سے

پڑھتے رہے اور جب کبھی با جماعت نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، تو سوادِ اعظم کی مسجد میں ہی نماز پڑھی، جس کا اہلِ تشیع کے ممتاز راہنما راجہ صاحب محمود آباد کو شکوہ کرنا پڑا۔

مولانا شبیر علی صاحب اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جناب مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی غالباً اپریل یا مئی ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے تھانہ بھون آئے کیونکہ اخیر عمر میں وہ مستقل طور پر خانقاہ اشرفیہ میں ہی رہتے تھے۔ انہوں نے حضرت (تھانویؒ) سے عرض کیا کہ جناح صاحب پر جناب کی تبلیغ کا بہت اثر ہوا ہے۔ میں راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں بیٹھا تھا جو حال ہی میں دہلی سے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو ایک عجیب واقعہ سناؤں۔ وہ یہ کہ جناح صاحب باقاعدہ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں اور نماز سنیوں کے طریق پر پڑھتے ہیں۔ گویا کہ یہ واقعہ حضرت کے فرستادوں کی فروری ۱۹۳۹ء کی ملاقات کے بعد کا ہے"۔

(ص۱۰)

چنانچہ اخیر وقت ان کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ بھی مسنون طریق پر ہوئی

خوف و خشیت

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب انسان کسی بہت اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے، تو وہ عجب و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو بھول جاتا ہے اور اپنی سرفرازی و سربلندی کو اپنی تدابیر اور زورِ بازو کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ مگر ایک صاحبِ ایمان ایک ثانیہ کے لیے بھی اپنے خالق و مالک کو نہیں بھول سکتا خواہ وہ دنیوی لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ تبلیغی وفد نے جب قائداعظم سے سوال کیا کہ:۔

"آپ پر بھی تو نماز فرض ہے، آپ کیوں نہیں پڑھتے ؟"

تو اس وقت وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ فرض کے لفظ سے دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والے قائد اعظم پر اپنے مالک و خالق کا اتنا رعب اور خوف طاری ہوا کہ وہ آگے کو جھک گئے اور اپنی کوتاہی کی ہماری طرح کوئی تاویل کرنے کی بجائے ایک خاصے مجمع کے سامنے نہایت ندامت کے لہجہ میں فرمایا کہ :۔

"میں گنہگار رہوں، خطاوار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔"

اور جب نماز شروع کی تو ان پر بحالتِ نماز خشوع و خضوع کی کیفیت طاری رہنے لگی اور وہ اکثر خلوت میں احکم الحاکمین کے دربار میں سر بسجدہ آہ و زاری کرتے دیکھے گئے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میرے ایک معتبر دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ ان سے مولانا حسرت موہانی صاحب نے بیان کیا کہ میں ایک روز جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم سے میں نے اطلاع کرنے کو کہا ملازم نے کہا کہ اس وقت ہم کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔ تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آویں گے۔ چونکہ مجھے نہایت ضروری کام تھا اور میں اس کو جلد سے جلد جناح صاحب سے کہنا چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے ملازم پر غصہ آیا اور میں خود کمرہ میں چلا گیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرہ میں۔ پھر تیسرے کمرہ میں پہنچا۔ تو برابر کے کمرہ سے مجھے کسی کے بہت ہی بلک بلک کر روتے اور کچھ کہنے کی

آواز آئی۔ آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی۔ اس لیے میں گھبرایا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناح صاحب سجدہ میں پڑے ہیں اور بہت ہی بے قراری کے ساتھ کچھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آگیا اور اب تو بھائی جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ اندر ہیں، تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ میرے تصوّر میں ہر وقت وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے"۔

نظریہ کی تبدیلی

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، قائدِ اعظم سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے متمنی تھے مگر جس روز حضرت تھانوی کے فرستادہ وفد نے قائدِ اعظم پر واضح کر دیا کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے سے برکت و کامیابی ممکن نہیں، تو انہوں نے مذہب کو سیاست پر فوقیت دینی شروع کر دی۔ ان کی تقاریر کا موضوع بدل گیا۔ ان میں اسلامیت کا رنگ غالب نظر آنے لگا اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ:

"اسلام صرف چند عقائد و عبادات کا نام نہیں، بلکہ اسلام سیاسیات معاملات، معاشرت اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ ہمیں ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا"۔

وضع اسلامی کی پابندی

قائدِ اعظم کی تعلیم و تربیت چونکہ انگریزی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے وہ انگریزی لباس پہننے کے عادی تھے۔ تبلیغی وفد نے انہیں وضع اسلامی اختیار کرنے کی ترغیب دی اور جب ان پر تشبہ فی الاسلام کی اہمیت اور تشبہ فی الکفار کی مضرت واضح ہو گئی تو انہوں نے ہر

وقت انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر دی اور اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظرِ عام پر نظر آنے لگے۔ جس کے بعد جناح کیپ، شیروانی اور شلوار قومی لباس کی حیثیت اختیار کر گئی۔

قرآن کا مطالعہ حضرت تھانویؒ نے خطوط اور وفود کے ذریعہ جو تبلیغی سلسلہ قائم کر رکھا تھا، اُس سے قائدِ اعظم کے دل میں تعلیماتِ قرآن پر عبور حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ انہوں نے قرآن کریم اور دیگر اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے ان کے خیالات میں بتدریج انقلاب آتا گیا۔ جب ان سے اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن میں طلباء نے سوال کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے خود اس امر کا انکشاف کیا اور فرمایا کہ:-

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ مُلّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے

احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کیلئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔" (حیاتِ قائدِ اعظم ص۴۲)

توکّل علی اللہ

حق تعالیٰ نے قائدِ اعظم کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ امارت وجاہت، ہمت، سیاست، عزّت عظمت، محبوبیت مقبولیت اختیار، اقتدار حاصل ہونے کے باوجود وہ اسباب پر نہیں بلکہ ہمیشہ مسبب الاسباب پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ساری جنگِ پاکستان بے سروسامانی کے عالم میں محض خدا کے بھروسہ پر لڑی اور جیتی۔ جب بھی دشمن نے اپنی قوتِ قاہرہ سے ان کی قوم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی، انہوں نے قوم کو للکارا اور فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے جب بھی کسی محاذ پر لوگ کمزوری محسوس کرنے لگے، انہوں نے انہیں خدا پر بھروسہ کرنے اور اس کی اعانت پر یقین کرنے کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ جس کی وجہ سے باد مخالف بھی موافق بن گئی۔ اپنے وسائل و ذرائع اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے والے ناکام اور خدا پر بھروسہ کرنے والے بے وسیلہ ہر میدان میں کامیاب رہے۔

پاکستان کے اوّلین یومِ استقلال کے موقعہ پر سکھوں نے قائدِ اعظم کو بم سے اُڑا دینے کی سازش کر رکھی تھی، جس سے ہندوستان کے آخری انگریز گورنر لارڈ مونٹ بیٹن بخوبی آگاہ تھے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے بوریہ بستر سمیٹنے کے لیے چونکہ قائدِ اعظم نے حسنِ تدبیر سے مجبور کیا تھا۔ اس لیے انگریز درون پردہ انہیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے پہلے تو قائدِ اعظم کو اس امر سے آگاہ نہ کیا۔ لیکن

جب قائداعظم نے انہیں یومِ استقلال کے موقعہ پر کراچی آنے کی دعوت دی تو تب انہوں نے اپنی جان کی حفاظت کی خاطر کراچی نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ :-

"اس موقع پر سکھوں نے آپ کو بم سے اُڑا دینے کا منصوبہ مکمل کر رکھا ہے - ایسے حالات میں نہ آپ کے لیے جلوس نکالنا مناسب ہے اور نہ میرے لیے اس میں شرکت ۔" (مشن وِد ماؤنٹ بیٹن)

مگر اس صاحبِ ایمان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا - انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تسلی دی کہ وہ خوف زدہ نہ ہوں - خدا تعالیٰ بہتری کرے گا - تب کہیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی آئے اور قائداعظم انہیں کھلی کار میں اپنے ساتھ بٹھا کر لاکھوں انسانوں کے ہجوم سے گزرے اور بخیر و عافیت گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بالارادہ محسوس کرایا کہ وہ بخیریت سے منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں - جس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دھڑکتے ہوئے دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور قائداعظم کی خدا اعتمادی کی تعریف کی -

اسی طرح سفرِ آخرت کی تیاری کے دوران میں جب ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب اور کرنل الٰہی بخش صاحب نے قائداعظم سے کہا کہ :-

"خدا آپ کو تادیر پاکستان کی رہنمائی کے لیے زندہ رکھے - آپ کے بعد کون ہے جو کشتیِ ملت کو بھنور سے نکال کر ساحلِ فتح و نصرت تک لے جا سکتا ہے ؟" (حیاتِ قائداعظم ص ۶۲۸)

تو قائداعظم نے انہیں اپنے رہنماؤں پر نہیں ، بلکہ خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی - آپ نے فرمایا :-

"گھبراؤ نہیں ! خدا پر اعتماد رکھو !! اپنی صفوں میں کجی نہ آنے دو اور انتشار

پیدا نہ ہونے دو۔ ملّت کے مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح نہ دو۔ انشاءاللہ قدرت تمہیں مجھ سے زیادہ عقیل اور ذہین رہنما عطا کرے گی۔ جو کشتیِ ملت کو مشکلات کے بھنور سے نکال کر ساحلِ مراد تک کامیابی سے پہنچاوے گا۔" (بحوالہ صدر)

انہوں نے اپنی قوم کو خُدا کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"اے خدا! تو نے ہی مسلمانوں کو آزادی عطا کی ہے۔ اب تو ہی ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ میری قوم ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے کمزور ہے۔ ابھی ان کی صفوں کا کج بھی دور نہیں ہوا۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے اور تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے۔" (بحوالہ صدر)

یہ اسی تفویض و توکل کا اثر ہے کہ رہنماؤں کی خودغرضیوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود پاکستان مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور انشاءاللہ مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔

عاجزی و انکسار

آج ہر کس و ناکس حصولِ پاکستان کو قائدِ اعظم کا تاریخی کارنامہ اور ملّت پر ان کا احسانِ عظیم بتلاتا ہے۔ مگر قائدِ اعظم اسے اپنا کارنامہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ آخری وقت فرماتے تھے کہ :۔

"یہ مشیّتِ ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاسِ سفید سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت

ہے، اپنا سکہ ہے، اپنا آئین ہے اور اپنا دستور ہے ۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اکرمؐ سے کیا تھا کہ اگر تیری اُمت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے ۔ خدا کے اس انعامِ عظیم کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن، بچے بوڑھے اور جوان پر فرض ہے ۔

جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہِ رب العزت میں سجدۂ شکر بجالانے کے لیے فرطِ انبساط سے جھک جاتا ہے ۔" (آخری لمحات)

اتنے بڑے انعام اور اتنی عظیم کامیابی پر فخر و غرور کی بجائے عجز و نیاز کا اظہار کرنے اور سجدۂ شکر بجالانے کی ایک غیر مومن سے کب توقع ہو سکتی ہے ۔

دُنیا سے نفرت

مردِ مومن جب اپنے صحیح مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ اس دُنیا کو اپنے لیے ایک قید خانہ سمجھنے لگتا ہے ۔ اس سے جلد رہائی حاصل کرنے اور اپنے آقا و مولا کے حضور میں پہنچنے کے لیے بے قرار رہتا ہے ۔ وہ موت سے خوف نہیں کھاتا، بلکہ اسے رحمت تصور کر کے اس کا منتظر رہتا ہے ۔ اسے دوسروں کی طرح دنیا و مافیہا کی محبت نہیں ستاتی ۔ دنیا کو چھوڑنے کا اُسے کوئی رنج و غم نہیں ہوتا، بلکہ وہ پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اس فانی دُنیا سے رخصت ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہی حالت قائداعظم کی تھی ۔

کوئٹہ میں علاج معالجہ سے جب کچھ افاقہ ہوا تو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش صاحب نے باتوں باتوں میں قائدِ اعظم سے کہا :-

"ہماری انتہائی کوشش ہے کہ آپ کی صحت اتنی اچھی ہو جائے کہ جتنی آپ کی صحت سات آٹھ برس پہلے تھی"۔

قائدِ اعظم یہ سُن کر مسکرائے اور فرمایا :-

"چند سال قبل یقیناً میری یہ آرزو تھی کہ مَیں زندہ رہوں - اس لیے نہیں کہ مَیں موت سے ڈرتا تھا، بلکہ اس لیے زندہ رہنا چاہتا تھا کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا ہے اور قدرت نے جس کام کے لیے مجھے مقرر کیا ہے، مَیں اسے اپنی زندگی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں - اب وہ کام پورا ہو چکا ہے - مَیں اپنے فرض کو ادا کر چکا ہوں - پاکستان بن گیا ہے - اس کی بنیادیں مضبوط ہیں - اب چند ماہ سے مجھے ایسے خیال آتے رہتے ہیں کہ مَیں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں - قوم کو جس چیز کی ضرورت تھی، وہ قوم کو مِل گئی ہے - اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس کی تعمیر کر کے اسے ناقابلِ تسخیر اور ترقی یافتہ ملک بنا دے اور حکومت کا نظم و نسق چلائے -

مَیں طویل سفر کے بعد تھک گیا ہوں - آٹھ سال تک مجھے قوم کے اعتماد پر دو عیّار اور مضبوط دشمنوں سے لڑنا پڑا ہے میں نے خدا کے بھروسہ پر انتھک محنت کی ہے - اور اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک حصولِ پاکستان کے لیے صَرف کر دیا ہے - مَیں تھک گیا ہوں، آرام

چاہتا ہوں۔ اب مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں اپنا کام کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا رنج نہیں ہوگا۔ لیکن میں زیارت میں مرنا نہیں چاہتا"

(آخری لمحات)

چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی یہ آخری خواہش بھی پوری فرمائی اور آپ کو قبل از رحلت زیارت سے کراچی لایا گیا۔

حُسنِ خاتمہ آخرت کی سرفرازیوں کی پہلی منزل حُسنِ خاتمہ ہے جو ایک مومن کی آخری نشانی ہے۔ زندگی کے بالکل آخری لمحات میں جب قائداعظم پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ کمزوری انتہا کو پہنچ گئی نبض کی دھڑکنیں غیر مسلسل ہوگئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں سانس رُک رُک کر آنے لگا۔ تو اس بے ہوشی کے عالم میں قائداعظم کے منہ سے جو دو آخری لفظ نکلے وہ

اللہ ــــــــــــ پاکستان

تھے۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی تلقین کرنے والا موجود نہ تھا۔ زندگی کی اس آخری نازک ترین گھڑی میں ــــــــــــ اللہ ــــــــــــ کا لفظ نوکِ زبان پر ہونا اور انتقال کے بعد تمام عالم اسلام میں ایصالِ ثواب کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا بلاتحریک و تحریص یا ترغیب و ترہیب ختمِ قرآن کریم کرنا ایک قابلِ رشک سعادت ہے۔ جو آج تک کسی عوامی رہنما کو حاصل نہیں ہوئی۔

مقامِ قائدِاعظم اس عنوان کے تحت تفصیل تو آپ کو "مشاہدات و واردات" میں ملے گی، البتہ ایک نیا واقعہ درج ذیل کیا جاتا ہے کہ حق تعالےٰ نے جو اپنے نیک بندوں کی مساعیِ خیر کی بنا پر ان کی ہر وقت تسلی

کے سامان کرتا رہتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کو اُن کی تبلیغ کے نتائج کا مشاہدہ ان کی زندگی میں بھی کرا دیا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا ارشاد ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ:۔

"میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے۔ گویا کہ میدانِ حشر سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیاء، علماء، صلحاء کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اسی مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی جناح آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔"

غلطِ فہمی

آج جو لوگ قائداعظم کی کامیابیوں کو ان کی سیاست کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قائداعظم کی کامیابی کا راز ان کی سیاست میں نہیں، بلکہ ان کے اخلاص اور ان کے تدیّن میں مضمر تھا۔ وہ حضرت تھانویؒ کی تبلیغی مساعی جمیلہ سے قبل دوسروں کی طرح ایک عوامی لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک محبوب رہنما کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ تبلیغ کے بعد ان کی زندگی میں جو مذہبی انقلاب آیا اس کی برکت سے۔

۱۔ قائداعظم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا جذبہ پیدا ہوا۔
۲۔ ان کے نطق کو اثر و تاثیر بخشی گئی۔
۳۔ عوام میں انہیں عزّت، عظمت اور محبوبیت و مقبولیت عطا ہوئی۔

۴۔ مخالفوں اور دشمنوں کے دلوں میں ان کی ہیبت بٹھا دی گئی اور
۵۔ انہیں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے انعام سے نوازا گیا۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی سیاست کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ ان کی سیاست مثل وضو کے تھی کہ گو نماز وضو پر موقوف ہے، مگر وضو خود مقصود اصلی نہیں بلکہ مقصود اصلی نماز ہے۔
ان حقائق و شواہد کے بعد اس بات کا قارئین کرام خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ قائد اعظم دیندار تھے، مومن تھے یا ــــــــ؟

تازیانۂ عبرت

قائد اعظم کی وفات کو تادم تحریر قریباً آٹھ سال گزر چکے ہیں، مگر وہ قوم جسے قائد اعظم کی جد و جہد نے ایک نئی سلطنت اور ایک نئی زندگی بخشی، اسے بھول چکی ہے۔ وہ آج تک اس کی شایان شان یادگار قائم نہیں کر سکی۔ اس قوم کے اہلِ قلم ان کی سیاسی زندگی کے علاوہ ان کی خانگی، مجلسی، اخلاقی، علمی، دینی، روحانی زندگی پر ریسرچ نہیں کر سکے۔ ان کی کوئی قابلِ قدر اور شایانِ شان سوانح حیات نہیں لکھی گئی۔ ان کی زندگی کے بہت سے حالات پر ابھی تک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بخلاف اس کے ان کی زندگی کے بعض مستور گوشوں کو روشنی میں لانے والے کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی اس محسن کشی کے مقابلہ میں انگریزوں کی دشمن نوازی ملاحظہ ہو کہ قائد اعظم جس قوم سے ہندوستان کی سونے کی چڑیا چھین لیتے ہیں جسے ہندوستان کی دو صد سالہ حکومت سے محروم کر دیتے ہیں، اسی قوم کا ایک اہلِ قلم قائد اعظم کا سوانح نگار مسٹر ہیکٹر بولیتھو لندن میں قائد اعظم کے یوم ولادت کے موقع پر ۲۶ جنوری ۱۹۵۶ء کو تقریر کرتے ہوئے

مجمع عام کے سامنے رو پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ :-

"میں نے اپنی زندگی میں گیارہ سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے لوگ اور بادشاہ بھی شامل ہیں۔ لیکن یقین کریں کہ میں جناح سے زیادہ کسی شخص سے متاثر نہیں ہوا۔ کتاب چھپ چکی ہے، بک بھی چکی ہو گی۔ میں دوسری کتاب لکھنے میں مصروف ہوں۔ اس کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں جناح کو نہیں بھولا۔ مجھے اس کی شخصیت سے محبت ہو گئی ہے۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ میرے دماغ سے اس کا خیال نہیں نکل سکتا۔"

آج سے تین سال پہلے جب کراچی میں قائد اعظم جنہیں کبھی دیکھنے کا مجھے شرف حاصل نہیں ہوا، کی تقاریر کا مطالعہ کر رہا تھا، تو میں اکثر رویا کرتا تھا کہ مجھے اس شخصیت کے بارے میں تفصیلی معلومات کیوں نہیں مل رہیں۔ یہ لیڈر شپ کی ایک ڈرا دینے والی مثال ہے۔ ایسی ہستی تاریخ میں پیدا نہیں ہوئی۔

مجھے افسوس ہے کہ پاکستانی اپنے قائد اعظمؒ کی قدر نہیں کر رہے۔ انہیں احساس نہیں کہ وہ کس قدر بڑی ہستی تھے۔ ان کو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیے کہ خدا نے ان کو جناح ایسا لیڈر دیا۔

(نوائے وقت ۱۳ جنوری ۱۹۵۶ء)

اپنوں کی تنگ دلی، غیروں کی وسیع النظرفی۔ اپنوں کی بے قدری، غیروں کی قدر دانی، اپنوں کا حسد، غیروں کا رشک، اپنوں کا بغض و عناد، غیروں کی محبت و عقیدت۔ اپنوں

کا خندہ و استہزا، غیروں کا تاسف و گریہ، اپنوں کی احسان فراموشی اور غیروں کی محسن شناسی باعثِ عبرت ہے۔

شرفِ ملتان سرزمینِ ملتان کو قائداعظم کے آبائی وطن ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس راز سے سب سے پہلے محترم اسد ملتانی نے قائداعظم کے ایک یوم پیدائش پر "ماہ نو" میں ایک مقالہ لکھ کر دنیا کو آگاہ کیا تھا۔ جس کا انکشاف خود قائداعظم نے نواب جمشید علی خاں صاحب کے اس سوال کے جواب میں کیا تھا کہ آپ میں "کرک" کہاں سے آئی؟ تو انہوں نے فرمایا۔ آپ کو پتہ نہیں کہ میں علاقہ ملتان کے ایک اچھوت خاندان سے ہوں۔" اس کی تائید اب مسٹر بولیتھو نے بھی ان کی سوانح حیات میں ان الفاظ میں کر دی ہے کہ قائداعظم کے COUSIN مسٹر محمد علی گانجی نے بتایا کہ ہمارا خاندان صحرائے سندھ کے شمالی علاقہ ملتان سے کاٹھیا واڑ میں آیا تھا۔ ملاحظہ ہو "جناح" ص۴

یہ اسی تعلق کا اثر تھا کہ قائداعظم کی مومنانہ اور مجاہدانہ خصوصیات کی یادگار قائم ہونے کے لیے سرزمین ملتان کو ہی منتخب کیا گیا۔ گوعیدگاہ کے قریب علوم قدیم و جدید کی ایک مثالی یونیورسٹی یعنی دارالعلوم بنانے کے لیے ایک وسیع ٹکڑہ اراضی حاصل کر لیا گیا ہے، مگر ابھی تک اس کی تعمیر و تشکیل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم گو آئینی طور پر آزاد ہو گئے ہیں، مگر ذہنی طور پر آزاد نہیں ہوئے ہم میں آزاد قوموں کی سی خو بو نہیں پائی جاتی۔ ہمیں اپنے شاندار ماضی کا کوئی احساس نہیں ہم ایک خود غرضانہ ماحول پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اپنے مشاہیر کی شایانِ شان یادگاریں قائم کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ جو ایک اہم ملی فریضہ ہے کہ اس سے حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

تعمیرِ پاکستان

اقدامِ اشرف

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے جون ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے تجویز پاکستان پیش کی۔ اس کے پورے دس سال بعد جب ان پر پاکستان کا منصۂ شہود پر آنا منکشف ہوا، تو انہوں نے وسط ۱۹۳۸ء میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے اربابِ اقتدار کو تبلیغ کرنے اور انہیں جنگ پاکستان کے لیے تیار کرنے کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباعِ احکامِ الٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی حاصل ہوتی ہے۔ محض اسبابِ ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لیے ہرگز کافی نہ ہوگا۔

اس غرض کے لیے ان کے ایماء پر "مجلس دعوۃ الحق" قائم کی گئی۔ جس کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل قرار پائے:۔

۱۔ مسلمانوں کی حفاظت و مدافعت کے لیے تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

۲۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا کہ اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

۳۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان کے پاس۔ ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا۔

۴۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرنا اور مجلس عاملہ سے مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور پہ شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم قرار دینے کی درخواست کرنا۔

سعیِ اقبال عین اس زمانہ میں جب کہ حضرت تھانوی قائداعظمؒ کو تبلیغ کرنے کے لیے وفد کی تشکیل میں مصروف تھے، علامہ اقبال قائداعظم کو اسلامی سلطنت کے قیام کے مطالبہ کی تائید کرنے کی ترغیب دینے میں مشغول تھے انہی دنوں علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا کہ :۔

"اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سے سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے، تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ، ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبات کا وقت آ گیا ہے؛

(مکتوب ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء)

انہوں نے اپنے دوسرے گرامی نامہ میں قائداعظم کو تحریر کیا کہ :۔

"صدر کانگریس (جواہر لعل نہرو) نے مسلمانوں کے سیاسی وجود سے صریحاً انکار کیا ہے۔ ان حالات کے تحت ہندوستان میں قیام امن کی واحد راہ یہی ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی مماثلت کے لحاظ سے ہندوستان کی دوبارہ

تقسیم عمل میں آئے مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے مراجعت سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری سکیم (پاکستان) ہی ہندوستان کے درد کا واحد درماں ہے۔" (مکتوب ۲۱ جون ۱۹۳۸ء)

گویا اس وقت اربابِ فراست و بصیرت پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ قدرت نے تعمیرِ پاکستان کے لیے قائدِ اعظم کو ہی منتخب کر رکھا ہے۔ اس لیے قائدِ اعظم اربابِ نظر کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

اجلاس پٹنہ

۱۹۳۸ء کے اخیر میں مجلس دعوۃ الحق نے اپنا کام شروع کر دیا اور حضرت تھانوی کے پہلے تبلیغی وفد نے قائدِ اعظم کو بمقام پٹنہ تبلیغ نماز کی اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں حضرت تھانوی کا تاریخی بیان پڑھا جس میں ممبران مسلم لیگ کی توجہ احکامِ اسلامی کی پابندی کی طرف مبذول کرائی گئی۔

اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ عملی جد و جہد کی طرف قدم بڑھایا اور ملک کے طول و عرض میں مسلم لیگ کی تنظیم کرنے، اس کی شاخیں قائم کرنے اور انہیں آنے والی جنگِ پاکستان کے لیے منظم کرنے کا پروگرام بنایا۔

مشکلات و موانعات

مسلم لیگ قائدِ اعظم کی قیادت میں جب نئے عزم و ارادہ سے میدانِ عمل میں اتری، تو اس وقت اس کی راہ میں حسب ذیل سنگِ گراں حائل تھے:۔

۱۔ کانگریس، جو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ جس کی ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ دار لاکھوں، کروڑوں روپوں سے امداد کر رہے تھے۔ جس کا ہندوستان کے بڑے بڑے مقتدر اور کثیر الاشاعت اخبارات پروپاگنڈا کر رہے تھے اور جس کی

پاکستان کی مخالفت کی خاطر، وہ ہندو جماعتیں بھی پشت پناہی کر رہی تھیں، جو کانگریس کے لائحہ عمل سے اختلاف رکھتی تھیں۔

۲۔ جمعیۃ العلماء ہند: ہندوستان میں علماء کا اثر و رسوخ مٹانے کے لیے اگرچہ ایک خاص قسم کا پروپاگنڈا جاری تھا، مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت مذہب پرست ہونے کی وجہ سے علماء کی تبع تھی۔ جن کی واحد نمائندہ جماعت جمعیۃ العلماء ہند تھی، جو تحریک خلافت کے زمانہ سے ملک میں متعارف تھی۔ جس کے ارباب اقتدار مسلمانوں کے مذہبی پیشوا تھے۔ جو اس وقت کے حالات کے ماتحت کانگرس کی تائید میں تھے۔ بلکہ اس کے بھی رکن تھے۔

۳۔ عدم اعتمادی: مسلم لیگ زیادہ تر عافیت پسند خطاب یافتہ حضرات پر مشتمل تھی، جنہیں رجعت پسند اور انگریزوں کا پٹھو کہا جاتا تھا۔ اُن کی اکثریت دیندار حضرات پر مشتمل نہ تھی۔ اسے متعارف علماء کرام کی تائید حاصل نہ تھی۔ عام مسلمان اور بالخصوص دیہات و قصبات میں رہنے والے مذہب پرست طبقہ اس سے مانوس نہ تھا۔ اس لیے عوام کا اسے اعتماد حاصل نہ تھا۔

ایسے حالات میں مسلم لیگ کے لیے تنظیم کوئی آسان کام نہ تھا۔

حمایت اشرف

حضرت تھانویؒ جانتے تھے کہ ہندو جو ہر قیمت پر ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر تلا ہوا ہے، تجویز پاکستان کو کسی قیمت پر قبول نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے مسترد کرانے کے لیے مسلمانوں کی فعال اور با اثر سیاسی جماعتوں کو بھی میدانِ عمل میں لے آئے گا۔ اس لیے انہوں نے مسلم لیگ کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس سے مسلمانوں کی حفاظت اور مدافعت کی انہیں زیادہ توقع تھی۔

چنانچہ جون ۱۹۳۹ء میں جب کہ مسلم لیگ اپنے تنظیمی منصوبہ کے ماتحت صوبوں اور ضلعوں میں از سرِ نو اپنی شاخیں قائم کر رہی تھی۔ حضرت تھانویؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) اور بعض دیگر اکابر دیوبند کے مشورہ سے مسلمانانِ ہند کو مسلم لیگ کی حمایت و مدد کرنے کا ان الفاظ میں فتویٰ دیا کہ :-

"گو مسلم لیگ متقی جماعت نہیں، بلکہ ایک سیاسی جماعت ہے۔ گو اس جماعت کے احاد میں اختلافِ مذاہب بھی ہے۔ مگر چونکہ اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت اس کا مقصودِ مشترک ہے۔ اس لیے اس وقت کی فضاء پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں اور جو متعصبین آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں۔ تاکہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔

زعماء کا کام اس وقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں اور ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے۔" (ضمیمہ تنظیم المسلمین)

اثرِ حمایت

صفِ علماء سے یہ پہلی آواز تھی جو مسلم لیگ کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس سے اربابِ غرض میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت تھانوی کا ملک کے طول و عرض میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ ان کے سینکڑوں خلفاء

ہزاروں منتسبین، لاکھوں معتقدین، قصبہ قصبہ اور قریہ بہ قریہ میں پھیلے ہوئے ہیں جن کی دیا[illegible]انت کا مخالفین کو بھی اعتراف ہے۔ اس لیے جہاں مخالفین نے مسلم لیگ کی مخالفت کی مہم تیز تر کر دی، وہاں وہ دیندار طبقہ مسلم لیگ کی حمایت میں علانیہ میدانِ عمل میں نکل آیا۔ جسے پہلے مسلم لیگ کی حمایت کی جرأت اس لیے نہ ہوتی تھی کہ متعارف علماء کرام کی اسے تائید حاصل نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور اس کے تنِ مردہ میں روح پڑ گئی۔ جہاں

نہیں بنے گا پاکستان

کی ایک آواز بلند ہوتی وہاں

بن کے رہے گا پاکستان

کے دس نعرے سننے میں آتے۔

"صالح" انقلاب

اسی سال ۱۹۳۸ء میں، جب کہ حضرت تھانوی قائد اعظم کے پاس تبلیغی وفد بھیجنے میں اور علامہ اقبال قائد اعظم کو ترغیبی خطوط لکھنے میں مصروف تھے۔ جناب مودودی صاحب کی مشہور کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کے پہلے دو حصے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

حصہ اوّل فروری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ، اس وقت کے حالات، آئندہ کے امکانات پر تبصرہ کیا ہے۔ حصہ دوم دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا جس میں اس وقت کے سیاسی حالات کا تفصیلی تجزیہ، اسلامی جماعتوں کی سیاسی روش پر تنقید، جدید انقلابی نصب العین کی توضیح کی گئی تھی اور پوری شرح و بسط کے ساتھ کانگریس کے استعمار پرستانہ عزائم کا تار و پود بکھیرا گیا تھا جس سے

یہ توقع پیدا ہوگئی تھی کہ مودودی صاحب بھی آگے چل کر نظریہ پاکستان کی تا[illegible] مطالبۂ پاکستان کی حمایت کریں گے۔ دوسری طرف کانگرسی حلقوں میں مودودی صاحب کی تحریریں پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔

سال ۱۹۳۹ء میں خدام دربارِ اشرفیہ تبلیغی مہم میں اور اربابِ مسلم لیگ اپنی تنظیمی مہم میں مشغول رہے اور جناب مودودی صاحب مذکورالصدر کتاب کا تیسرا حصہ لکھتے رہے جس کے بعض حصے وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پسِ پردہ کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ جن کی وجہ سے مودودی صاحب نے اپنا موقف بدل لیا ہے اور ان کے خیالات و نظریات میں انقلاب آگیا ہے کیونکہ اب مودودی صاحب اپنا سارا زورِ قلم اربابِ مسلم لیگ کو بے دین، علمائے کرام کو گم کردہ راہ ثابت کرنے اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرنے میں لگا رہے تھے اور اس طرح ایک صالح انداز میں کانگرسی مقاصد کی تائید کر رہے تھے۔ وہ جو کچھ لکھ رہے تھے اس کے لیے خود اُن کا ضمیر انہیں سرزنش کر رہا تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ اپنے مقام سے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا کتاب کے تیسرے حصے کے دیباچہ کے الفاظ سے ظاہر ہے :۔

"مسلمان اور موجودہ کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کی اشاعت کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے

اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں" (صلا)

اس وقت اُن اسباب کی تلاش بے سود ہے کہ مودودی صاحب خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے پر کیوں مجبور ہیں - ان پر آنے والا مورخ ہی روشنی ڈالے گا - دیکھنا یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نظریات میں جو صالح انقلاب آیا اس سے فائدہ کس کو پہنچا۔

فتویٰ مودودی

تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کو کوئی قوم براہِ راست اتنا نقصان نہیں پہنچا سکی، جتنا اس نے مسلمانوں کو واسطہ بنا کر نقصان پہنچایا ہے۔ عین اس وقت جب کہ ہندو سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور اسلام کی حفاظت اور دشمنانِ اسلام کی مدافعت کرنے کے لیے علماء کرام جمہور مسلمین کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں مصروف تھے مودودی صاحب نے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے حسب ذیل فتویٰ دیا کہ :-

۱- "لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صلا)

۲- یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے، جہاں اسلام کی قوتِ تسخیر چھپی ہوئی ہے"۔ (ایضاً صلا)

۳- اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں - اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات - مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے - تو سب کی سب جنسِ کاسد (کھوٹی) نکلیں

گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماءِ دین و مفتیانِ شرعِ متین۔ دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوبائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ امپریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں"۔

(ایضاً ص۸)

مودودی صاحب کی ان "اسلامی تحریروں" نے "صالح رنگ" میں مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس قدر نقصان پہنچایا، اتنا نقصان کانگرس، جمعیۃ العلماءِ ہند، خدائی خدمتگار وغیرہ بھی نہ پہنچا سکے تھے۔ باایں ہمہ مودودی صاحب کی خودغرضانہ آواز، علماءِ ربانی کی مخلصانہ آواز میں دب کر رہ گئی اور مسلمانوں نے "گم کردہ راہ علماء کرام" کی ترغیب پر "اسلام سے ناواقف مسلم لیگ" کے جھنڈے تلے جوق در جوق جمع ہو کر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس کر دیا جس سے مخالفین پاکستان کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

جماعتِ اسلامی کی بنیاد مودودی صاحب چونکہ نظریہ و مطالبہ پاکستان کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، بلکہ مامور ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے منظم طریق پر پاکستان کی مخالفت کرنے کے لیے پاکستان

ریزولیوشن پاس ہونے کے پانچ ماہ بعد اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اور "جماعت اسلامی کی تشکیل" کے زیر عنوان انہوں نے لکھا کہ :-

۱۔ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بنیادی طور پر بدل دینا ہے۔

۲۔ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اسی طریقہ پر ممکن ہے، جو انبیا علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔

۳۔ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے۔

۴۔ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو۔ اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریقہ پر کام کرے۔

میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی، کہ مسلمانوں میں جو بڑی بڑی جماعتیں اس وقت "قائم ہیں" وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی تبدیلی کر لے جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت باقی نہ رہے۔ مگر افسوس کہ ہمیں اپنی اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اُن لوگوں کو جمع کریں، جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ شعبان ۱۳۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) میں ہم نے اُن لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے "جماعتِ اسلامی قائم کی"۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۶۹)

گاندھی جی کی اپیل

جب دشمنان پاکستان جماعتِ اسلامی کی شکل میں ہماری صفوں کے اندر اپنا مورچہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو گاندھی جی نے قائدِ اعظم کو ایک خط روانہ کیا جس میں ان سے درخواست کی گئی کہ وہ مطالبۂ پاکستان ترک کر دیں۔ گاندھی جی نے لکھا کہ:۔

"میں دو قوموں کے نظریہ پر جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی وہ میرے نزدیک تشویش انگیز بنتا جاتا ہے۔ میں اس استدلال کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان ملک کے بقیہ باشندوں سے الگ ایک قوم ہیں۔ اس استدلال کو تسلیم کر لینے کے نتائج حد درجہ خطرناک ہوں گے۔ اگر ایک مرتبہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستان کو ان گنت ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے مطالبات کی کوئی انتہا نہ رہے گی"۔ (مکتوب مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۴ء)

مگر قائدِ اعظم کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔

جماعتِ اسلامی کی پاکستان دشمنی

اتنے میں ۱۹۴۵ء کا وہ تاریخی الیکشن سر پر آگیا جس نے اس برِ عظیم کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا کہ یہ اکھنڈ رہے یا ہندو پاکستان میں تقسیم ہو جائے۔ اسی الیکشن کے نتائج نے ہی گاندھی جی کے مذکورہ بالا خط کا جواب دینا تھا۔ بعض خوش فہم لیگی حضرات کا خیال تھا کہ جماعتِ اسلامی اس الیکشن میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی امداد کرے گی اور مسلم لیگ کا ساتھ دے گی۔ چنانچہ انہوں نے مخلصانہ طور پر جماعتِ اسلامی کو اس سلسلہ میں دعوت بھی دی جو اس نے ٹھکرا دی اور صاف اعلان کر دیا کہ:۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر

لیجیے - پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو۔ بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں، جن پر ایمان لائے ہیں"۔ (کوثر ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

یہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے پاکستان کی پہلی عملی مخالفت ہی نہ تھی، بلکہ کانگرس کی خاموش تائید بھی تھی۔ کیونکہ اس "ایماندار" اور "با اصول" جماعت کا اس تاریخی الیکشن میں مسلم لیگ کی حمایت نہ کرنے کا فائدہ گاندھی جی اور ان کی کانگرس کو ہی پہنچنا تھا۔

مولانا مدنی کی ترغیب

جس زمانہ میں دارالاسلام پٹھانکوٹ سے مودودی صاحب کا یہ "فتویٰ" جاری ہوا کہ پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن میں جماعتِ اسلامی حصہ نہ لے۔ اسی زمانہ میں سہارنپور میں جمعیۃ العلماء ہند کی کانفرنس ہوئی جس میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی حمایت کرنے کی بجائے کانگرس میں شرکت کرنے کا مشورہ دیا اور کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل کو بدیں وجہ جائز قرار دیا کہ :-

"جب کونسلوں، میونسپلٹیوں میں ہندوؤں سے اشتراکِ عمل جائز ہے تو دوسرے معاملات میں کیوں نہیں ؟"

نازک ترین دور

"تاریخ پاکستان کا یہ نازک ترین دور تھا مجلس احرار، نیشلسٹ مسلمان، جماعت اسلامی، جمعیۃ العلماء ہند اور خدائی خدمتگار اپنی اپنی اغراض و مصالح کی بناء پر پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ بنائے ہوئے تھے۔ اور بالواسطہ یا بلا واسطہ کانگرس کی تائید کر رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی ایک جماعت کانگریس کی حامی اور جمعیۃ العلماء ہند کی رکن تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مفتی تھے اور حضرت تھانویؒ کے خلیفہ و مجاز ہونے کی حیثیت سے وہ مسلم لیگ اور پاکستان کی تائید میں تھے۔ اس لیے مسئلہ پاکستان پر ان کے ساتھ اختلافات کا دروازہ کھلا۔ بحث مباحثہ کی نوبت آئی اور بالآخر دارالعلوم دیوبند کو اس اختلاف کے خراب اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور چند دیگر اکابر علماء نے دارالعلوم سے ضابطہ کا استعفیٰ دے دیا اور آزادانہ پاکستان کی حمایت کے لیے اپنے اوقات وقف کر دیئے۔

مولانا ظفر احمد کا بیان

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اوّلین فرصت میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے اس خطبہ کی تردید میں ایک زوردار بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کو جائز قرار دیا تھا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ:۔

"مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ جہادِ آزادی میں اشتراکِ عمل اس شرط سے جائز ہے کہ حکم اہل شرک غالب نہ ہو۔ مسلمان مشرکین کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوں بلکہ مشرکین اسلامی جھنڈے کے نیچے ہوں۔ چنانچہ شرح سیر کبیر ص ۲۲۱ جلد ۳ میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ اب فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ میں ہے کہ کانگریس میں اس وقت حکم شرک غالب ہے یا حکم اسلام؟"

رہا مطالبہ پاکستان! سو جب تمام ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا بحالت موجودہ کسی طرح ممکن نہیں، تو کم از کم ان صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے

اسلامی سلطنت بنا لینا کہ وہاں اسلامی سلطنت، اسلامی اصول پر قائم کی جا سکے، لازم اور ضروری ہے"۔ (حیات محمد علی جناح ص ۴۵۳)

کونسلوں اور میونسپلٹیوں کی مثال کا جواب دیتے ہوئے مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ:-

"ان محکموں میں ہندو مسلم اشتراکِ عمل، صرف حقوقِ غلامی میں اشتراک ہے حکومت نے غلاموں کے سامنے روٹیوں کے چند ٹکڑے ڈال دیئے ہیں کہ ان کو حصہ رسدی تقسیم کر لو۔ ہندو مسلمان ان کو حصہ رسدی تقسیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی فریق اپنا حصہ نہ لے، بھوکا مرے گا۔ اس کو اس اشتراکِ عمل سے جس کا نام جہادِ آزادی رکھا گیا ہے، دور کی بھی نسبت نہیں۔ کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل، جہادِ آزادی میں اشتراکِ عمل ہے جس پر مذہبی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ موت و حیات کا مدار ہے"۔

(ایضاً ص ۴۵۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی کی تائید

اس زمانہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب صاحبِ فراش تھے اور طویل علالت کی وجہ سے سیاسیات سے عملاً الگ ہو چکے تھے۔ مگر حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی اس لیے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے انہیں علالت کے باوجود رہنمائی پر مجبور کیا اور وہ بالآخر اس شرط پر سیاسیات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے کہ وہ علالت کی وجہ سے کوئی کام نہ کر سکے، تو مولانا ظفر احمد عثمانی ان کی نیابت کرتے رہیں گے۔ جسے مولانا عثمانی نے منظور کر لیا۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے علالت و نقاہت کے باوجود مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے مذکورہ بالا بیان کی تائید میں مندرجہ ذیل بیان جاری کیا:-

"کانگرس کے دائرہ میں، جہاں ہندو عناصر کے کھلے ہوئے غلبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر تو یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سب کو راہِ راست پر لے آئیں گے۔ لیکن مسلم لیگ کے متعلق جو خالص مسلمانوں کی جماعت ہے، کیا اس امید کے دروازے بند ہو چکے ہیں؟ یہ چیز کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔

مسلم لیگ کلمہ گو مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں ہزار عیب سہی تاہم غیر مسلم قوموں کی نسبت تو وہ ہم سے قریب تر اور مفید تر ہے۔ اگر مسلم لیگ ناکام ہو گئی تو قوی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول ہی شاید ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے اور مسلمانوں کے قومی و سیاسی استقلال کی آواز فضائے ہندوستان میں پھر کبھی سنائی نہ دے۔ پاکستان ایک اصطلاحی نام ہے۔ یہ نام سن کر کسی کو بھی یہ غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس خطہ میں فوراً بلا تاخیر خلافتِ راشدہ یا خالص قرآنی اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ضرورت سے زیادہ امیدیں ولانا یا توقعات باندھنا کسی عاقبت اندیش حقیقت پسند کے لیے زیبا نہیں ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومت عادلہ قائم ہونے پر کسی وقت منتہی ہو سکتا ہے۔"

(عصر جدید۔ کلکتہ ۲۱ جون ۱۹۴۵ء)

ان بیانات نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ جو لوگ ابھی تک مسلم لیگ کی حمایت کے لیے آمادہ نہ ہوئے تھے، وہ اس میں شامل ہو کر اس کے معاون و مددگار بن گئے۔

جمعیتہ علماءِ اسلام

پاکستان کے تمام پر لڑے جانے والے الیکشن قریب آگئے تھے۔ مخالفین کی طرف سے اس قسم کا پروپاگنڈا زوروں پر تھا کہ "مسلم لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے" - "اسے جماعتِ علماء کی تائید حاصل نہیں ہے"۔ اُدھر اربابِ لیگ بُری طرح محسوس کر رہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء ان کے شانہ بشانہ کام نہ کریں، الیکشن جیتنا آسان کام نہیں - چنانچہ ان کے تقاضا پر اور حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ملک کے مقتدر علماء کرام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رح مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی رح مولانا ابو برکات عبدالرؤف دانا پوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام مرشد خطیب جامع عالمگیری وغیرہ نے نومبر ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں جمع ہو کر ایک عظیم الشان علماء کانفرنس منعقد کی اور جمیعۃ علماء اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جس کے صدر علامہ شبیر احمد عثمانی منتخب کیے گئے۔ اس کانفرنس متفقہ طور پر مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا۔ اور ایک قرارداد کے ذریعہ مسلم ووٹروں سے اپیل کی کہ مسلم لیگ کے نمائندہ کے سوا کسی دوسری جماعت کے نمائندہ کو ووٹ دینا :-

> "اتحادِ ملت، مفادِ ملت، استقلالِ اسلام اور مستقل قوم کے مقاصد کے خلاف ہے۔ کیونکہ پاکستان کے سوال کا فیصلہ بڑی حد تک ان انتخابات کے نتائج پر موقوف ہے"

مزید برآں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مذہبی اور علمی حیثیت سے مطالبۂ پاکستان حمایت مسلم لیگ، کانگرس سے اختلاف اور متحدہ قومیت کے خلاف دو قومی نظریہ پر قرآن و حدیث اور فقہی دلائل کی روشنی میں بہت سے فتاویٰ اور رسائل

لکھ کر شائع کیے۔ جن میں سے رسالہ "کانگریس اور مسلم لیگ" ۔ "افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ" بڑے مفید ثابت ہوئے۔

علاوہ ازیں یہ علماء کرام، جن کا مذاق ہی شروع سے الیکشنوں کے طوفان سے یکسوئی تھا، ملک کے طول وعرض میں مسلم لیگ کی امداد اور پاکستان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پھیل گئے۔ کیونکہ یہ الیکشن ایک ایسے مقصد کے لیے لڑا جا رہا تھا۔ جس پر ہندوستان میں دینِ اسلام کے بقاء کا دار و مدار تھا۔

لیاقت کاظمی الیکشن

کانگریس اس الیکشن میں مسلم لیگ کو ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ برلوں اور ڈالمیوں نے پانی کی طرح روپیہ بہانا شروع کر دیا تھا اور ہندوستان کی تمام سیاسی مسلم جماعتیں اس کے مقابلہ میں لا کھڑی کی تھیں۔

قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کا الیکشن اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل کر گیا کہ انہیں ناکام کرنے کے لیے کانگریس نے حضرت تھانوی کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی کے ایک عزیز محمد احمد صاحب کاظمی کو ان کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ کیونکہ اربابِ کانگریس اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ عوام میں جو مقبولیت خدام دربارِ اشرفیہ جو مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے مصروف جدوجہد تھے۔ کاظمی صاحب کے مقابلہ میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی حمایت بوجہ رشتہ داری نہیں کر سکیں گے۔ دوسری طرف کاظمی صاحب کی امداد کے لیے انہوں نے خود مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو اس محاذ پر بھیج دیا تھا۔

مولانا عثمانی کی قربانی

اس پر نواب زادہ لیاقت علی خاں نے سردار امیر اعظم خاں صاحب (وزیر مملکت پاکستان) کو اپنا خط دے کر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا شبیر علی صاحب تھانوی مہتمم خانقاہ امدادیہ کے پاس تھانہ بھون بھیجا اور انہیں لکھا کہ اگر آپ اس وقت دورہ پر نہ نکلیں گے تو مسلم لیگ کی کامیابی دشوار ہے۔ مولانا شبیر علی صاحب نے بھی مولانا ظفر احمد صاحب سے سفارش کی کہ اس درخواست کو ہرگز رد نہ کیا جائے۔ اس پر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رشتہ داری کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اپنے ذاتی مفاد کو قربان کرتے ہوئے، ملی مفاد کی خاطر اپنے ایک عزیز کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کے لیے میدانِ الیکشن میں نکل آئے اور سردار امیر اعظم خاں کے ہمراہ سہارنپور۔ ڈیرہ دون، مظفر نگر، بلند شہر کے اضلاع میں مولانا مدنی کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

پریشان کن حالات

اس وقت حالات کتنے پریشان کن تھے، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ جو خواجہ آشکار حسین صاحب کے اس مقالہ سے نقل کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی برسی پر بعنوان "لیاقت بنارِ پاکستان ہے" رسالہ "نقاد" میں شائع کرایا تھا اور جسے بعد میں اخبار پیام مورخہ ۱۹ را اکتوبر ۱۹۵۵ء نے نقل کیا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ :-

> "سب سے زیادہ مقابلہ خود لیاقت علی خاں کے حلقہ میں تھا۔ مقابل امیدوار محمد احمد کاظمی تھے۔ کانگرس کی جانی و مالی امداد انہیں حاصل تھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ مزید برآں یہ علاقہ مولوی زادہ

اور پیرزادہ ۔ مولوی ہی پیر بھی تھے اور اُن کی اکثریت مسٹر کاظمی کے ساتھ تھی ۔ لیکن مقابلہ میں لیگ کی انتخابی مشنری کا کوئی پرزہ بھی درست نہ تھا ۔ لیاقت علی دہلی سے باہر نہ نکل سکتے تھے ۔ انہیں پورے ملک کے انتخابات کی فکر تھی، اپنے حلقہ کا کیسے خیال ہوتا؟ جب حالات بدتر ہونے لگے، تو انہیں سنبھالنے کے لیے علی گڑھ سے طلباء کی یلغار کی گئی ۔ مجھے بھی پروفیسر علیم نے ایک وفد کے ساتھ روانہ کیا ۔ خورجہ، بلند شہر، ہاپوڑ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حالات کا کہیں نام و نشان نہیں ۔ آخر مظفر نگر پہنچ کر ہدایات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ۔ وہاں بھی یہی بد حالی تھی ۔ لیاقت علی خاں کے مینجر سردار اکرم خاں، ان کے صاحبزادے امیر اعظم خاں اور طلباء علی گڑھ کے سربراہ پروفیسر عمر سب دم بخود تھے ۔ فیصلہ ہوا کہ پروفیسر عمر دہلی جا کر لیاقت علی خاں کو لائیں اور دوسری طرف کسی نہ کسی طرح مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند کا فتویٰ اپنی موافقت میں حاصل کیا جائے ۔ کیونکہ تنہا علامہ عثمانی کی تائید اس حلقہ میں خصوصاً مظفر نگر اور سہارنپور میں ناکافی تھا ۔ دیو بند جاتے ہوئے سب کو ڈر لگتا تھا ۔ قرعہ فال میرے نام پر پڑا ۔ میں وہاں پہنچا ۔ دو دن کی رد و قدح کے بعد فتویٰ حاصل کیا اور اسے اخبارات کو بھیج کر اور ضروریات کے مطابق پوسٹر چھپوا کر ہم سہارنپور پہنچے ۔ وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے

فتویٰ کے بغیر کام نہ چلے گا۔ میں نے دیو بند جا کر موصوف کا فتویٰ بھی حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو پولنگ ہونے والا تھا۔ ۲۴ر نومبر کو لیاقت علی خاں سہارنپور پہنچے۔ میں فوراً ڈاک بنگلہ پہنچا۔ لیاقت علی خاں بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے اور پہلے فتویٰ کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتویٰ بھی پیش کر دیا۔ دیکھ کر اچھل پڑے۔ الخ"

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے لیے علماء ربانی کی تائید حاصل کیے بغیر یہ تاریخی الیکشن جیتنے قریباً قریباً ناممکن تھے۔ ان اکابر علماء کے فتووں اور مولانا عثمانی کے دوروں نے رائے عامہ کو مسلم لیگ کی تائید پر مجبور کر دیا اور نوابزادہ لیاقت علی خان اپنے بے غرض اور مخلص دوستوں، ہمدردوں اور علماء کرام کی مساعی جمیلہ سے تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کانگریس کے نمائندہ کے مقابلہ میں جیت گئے۔ یہ جمیعۃ علماء ہند کے مقابلہ میں جمیعۃ علماء اسلام کی پہلی شاندار کامیابی تھی اور مسلم لیگ کی بے نظیر فتح۔

اعترافِ لیاقت

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے فوراً تھانہ بھون مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو مبارک باد کا تار بھیجا اور بعد ازاں انہیں یہ شکریہ کا مفصل خط روانہ کیا:۔

"دفتر آل انڈیا مسلم لیگ
دریا گنج۔ دہلی

چٹھی نمبر ۵۰۰ء
۱۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء

محترم المقام زاد اللہ مکارمکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'!

میں انتہائی مصروفیتوں کے باعث اس سے قبل آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں اللہ پاک نے ہمیں بڑی نمایاں کامیابی عطا فرمائی اور اس سلسلہ میں آپ جیسی ہستیوں کی جدوجہد بہت باعثِ برکت رہی۔ آپ حضرات کا اس نازک موقع پر گوشہ عزلت سے نکل کر میدانِ عمل میں اس سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کرنا بے حد مؤثر ثابت ہوا۔ اس کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خصوصاً اس حلقہ انتخاب میں جہاں سے ہماری لیگ نے مجھے کھڑا کیا تھا، آپ کی تحریروں اور تقریروں نے باطل کے اثرات بہت بڑی حد تک ختم کر دیئے۔

بہرحال اب اس سے بھی سخت تر معرکہ سامنے ہے۔ لیکن ہمیں اللہ کے فضل سے قوی امید ہے کہ دشمنانِ ملت اس معرکہ میں بھی خاسر و نامراد رہیں گے۔ امید ہے کہ اس عرصہ کے لیے آپ کو رخصت مل جائے گی اور آپ کی تحریریں اور تقریریں اور مجاہدانہ سرگرمیاں آنے والی منزل کی دشواریوں کو بھی معتدبہ حد تک ختم کر سکیں گی۔ والسلام مع الاحترام

لیاقت علی خان!"

قائد ملت کا یہ خراجِ تحسین ان اربابِ غرض کے لیے جو آج پاکستان سے علمائے کرام کا اثر و رسوخ مٹانے کے درپے ہیں، سرمۂ بصیرت اور تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتا ہے۔

مکالمۃ الصدرین

یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمیعۃ العلماء ہند دہلی اپنی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے اور بضمن عیادت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دورانِ مزاج پرسی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے علامہ عثمانی سے فرمایا کہ:

"ہمیں کچھ آپ سے حالاتِ حاضرہ پر گذارشات کرنی ہیں۔ مسئلہ پر شرعی حیثیت سے تو ہم آپ سے کیا گفتگو کرتے، یہ درجہ تو ہمارا نہیں۔ البتہ کچھ واقعات ایسے بیان کرنے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ آپ کے علم میں نہ آئے ہوں۔ ممکن ہے ان واقعات کو سن کر حضرت والا کی جو رائے (لیگ و پاکستان کے بارہ میں) قائم شدہ ہے، اس میں تغیر ہو جائے"۔ (مکالمۃ الصدرین ص۳)

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں گفتگو کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ جب دل چاہے تشریف لاویں۔ چنانچہ ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء بروز جمعہ ساڑھے آٹھ بجے (۱) مولانا حسین احمد صاحب مدنی صدر جمیعۃ العلماء ہند (۲) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمیعۃ العلماء ہند (۳) مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم اعلیٰ جمیعۃ العلماء ہند (۴) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حال ناظم اعلیٰ جمیعۃ العلماء ہند (۵) مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی (۶) مولانا عبد الحنان صاحب اور علامہ عثمانی کے برادر زادہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، علامہ عثمانی کے دولتکدہ پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے ان حضرات کا خیر مقدم کیا۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی۔ اس کے بعد مجلس پر سکوت چھا گیا کہ گفتگو کی ابتداء

کون کرے اور کس مسئلہ سے کرے۔

چونکہ گفتگو کے خواہشمند متذکرہ بالا حضرات تھے اور اسی غرض کے لیے تشریف لائے تھے، اس لیے علامہ عثمانی خاموش رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے گفتگو کی ابتداء کی اور ایک طویل تقریر کی، جو پون گھنٹہ تک جاری رہی۔ علامہ عثمانی نے ساری تقریر بغور سننے کے بعد فرمایا کہ:۔

"مجھے پورے الفاظ اور اجزا تو آپ کی لمبی چوڑی تقریر کے محفوظ نہیں رہے البتہ جو تلخیص میرے ذہن میں آئی ہے اس کے جوابات بلالحاظ ترتیب عرض کرونگا۔ اگر کوئی ضروری بات رہ جائے، تو آپ یاد دلا کر اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہیں"۔

گفت و شنید کا یہ سلسلہ سوا تین گھنٹے مسلسل جاری رہا۔ اس مکالمہ میں سب سے زیادہ حصہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لیتے رہے۔ دوسرے درجہ میں مولانا احمد سعید صاحب شریک رہے۔ مگر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو مزاج پرسی کے بعد سکوت اختیار فرمایا، وہ ختم مجلس تک قائم رہا اور کسی موقعہ پر بھی ایک حرف نہ بولے۔ البتہ آخر میں مولانا حسین احمد صاحب نے پندرہ منٹ گفتگو فرمائی۔

ملاقات کی غرض

جمعیۃ العلماء ہند کے ان ذمہ دار حضرات کا خیال تھا کہ علامہ عثمانی کو جو ایک عرصہ سے سیاسیات سے الگ تھلگ رہ رہے تھے سیاسی معلومات کم ہوں گی اور ہم اپنے پیش کردہ واقعات سے انہیں متاثر کر سکیں گے اور انہیں پھر سیاسیات سے کنارہ کشی پر آمادہ کر لیں گے۔ مگر علامہ عثمانی نے اپنی بے پناہ سیاسی حذاقت کا ثبوت دیا اور ان کے پیش کردہ

اشکالات کا کوئی جواب بھی ان حضرات سے نہ بن پڑا۔

علامہ عثمانی کا جواب

مولانا عثمانی نے انہیں صاف فرمایا کہ :۔

" مَیں نے جو رائے پاکستان کے متعلق قائم کی ہے وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے ۔جمیعۃ علماء اسلام قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی ۔کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے مسلمانوں کو ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم پر ہونا چاہیئے اور علماء ملت کو اس کی پشت پناہی اور اصلاح میں جدوجہد کرنی چاہیئے ۔

آپ کا یہ دعویٰ کہ پاکستان قائم ہونے میں سراسر مسلمانوں کا نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے ۔اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہندو پاکستان سے پھر کیوں اس درجہ مضطرب وخائف اور اس کی انتہائی مخالفت پر تلا ہُوا ہے اور ان کا اعلان ہے کہ پاکستان ہماری لاشوں پر بن سکتا ہے اور کہ جو جماعت یا جو شخص پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف کھڑا ہوگا، کانگرس اس کی ہر طرح امداد کرے گی ۔

مَیں اس امر پر بحث نہیں کرتا کہ مسلم لیگ راجاؤں، نوابوں، خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت ہے ۔آپ جو چاہیں کہیں، لیکن مسٹر جناح کے متعلق تو میرا یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا وہ کسی دباؤ یا لالچ میں آسکتے ہیں یا کسی قیمت پر خریدے جاسکتے ہیں ۔

آپ کا یہ اشکال کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بعض فرقے علماء کے اقتدار کو مٹانا اور دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک اس

کا حل یہ ہے کہ آپ سب حضرات مسلم لیگ میں داخل ہو جائیں اور داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیں۔ پھر ہم عوام کے ذریعہ جو مفید صورت مسلمانوں کے لیے ہوگی، بروئے کار لا سکیں گے۔ کیا ہمارا اتنا بھی اثر نہیں کہ ہم دو چار لاکھ ممبران بھرتی کرا سکیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ آپ حضرات سے مل کر اس کام میں حصہ لوں۔ میرے نزدیک تو اصلاح کی یہی بہترین شکل ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ میں ہمیشہ سیاسیات سے کنارہ کش رہا۔ اس الیکشن میں کیا داعیہ پیش آیا کہ میں نے شرکت کر لی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس الیکشن کی نوعیت پچھلے الیکشنوں سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اس مرتبہ منتخب ہونے والی اسمبلیاں ہی آئندہ ہندوستان کا مستقل دستور بنائیں گی۔ چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ وابستہ ہے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر مسلمانوں کی امداد کی جائے، جو استقلال ملت اور مسلم حق خود ارادیت کے حامی ہیں۔

آپ کی خواہش کہ میں ایسے موقع پر نرمی یا سکوت اختیار کروں بجا لیکن جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں، ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لیے سکوت کیسے مناسب ہے۔" (مکالمۃ الصدرین)

شبیرِ پاکستان کا عزمِ شہادت

اس وفد کی گفتگو کا الٹا اثر ہوا۔ ان کے اشکالات اور لاجواب ہونے نے علامہ عثمانی کے موقف کو پختہ تر کر دیا اور انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو دیوبند کے ایک

عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ میں :-

"ایک عرصہ سے عافیت نشین تھا اور میری طویل علالت و خرابیٔ صحت کا اقتضا بھی یہی تھا لیکن آج ملت اسلامیہ ایسی جد وجہد سے دوچار ہے کہ اس کے نتائج و عواقب اس قدر اہم ہیں کہ وہ مجھے اس بیماری کی حالت میں بھی سیاست میں کھینچ لائے ۔ تحریک خلافت کے بعد سے میں سیاست سے کنارہ کش ہوں ۔ لیکن عرصہ دراز کی کاوشوں اور غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر حصولِ پاکستان کے لیے میرے خون کی ضرورت ہو تو میں اس راہ میں اپنا خون دینا باعثِ افتخار سمجھوں گا اور اس سے ہرگز دریغ نہیں کروں گا ۔ اس ملک میں ملتِ اسلامیہ کا وجود و بقا اور مسلمانوں کی عزت زندگی قیامِ پاکستان سے وابستہ ہے ۔ میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا ۔ اگر اس مقصد کے حصول میں کام آجاؤں "۔

(حیات محمد علی جناح صہ ۴۵۸)

سردار پٹیل کا اعلان

کانگریس جب ارباب جمیعۃ علمائے اسلام کو رام کرنے میں ناکام ہوئی ، تو اس کے مردِ آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے جو مسلمان دشمنی میں سیواجی کے صحیح جانشین تھے ۔ گوالیا ٹینک (بمبئی) کے میدان میں کانگریس کی سالگرہ کے تاریخی موقعہ پر ۲۹ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مسلمانوں کو کہا کہ :-

"حکومت مسلمانوں کو پاکستان تو کیا ایک انچ زمین بھی نہیں دے گی پھر بھی مسلمان پاکستان کا شور مچاتے ہیں ۔ پاکستان اگر مل سکتا ہے ، تو ہندوؤں سے "۔ (بحوالہ مصدر صہ ۴۰۷)

پنڈت نہرو کی نصیحت

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو حیدر آباد سندھ میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ

"خود مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ پاکستان کو نہ لیں۔ جسے وہ باقی نہ رکھ سکیں گے اور جسے ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اسے دوسری قومیں ہضم کر لیں گی۔ جنگِ عالم گیر نے ہمیں یہ سبق سکھایا ہے کہ چھوٹی قوموں کے لیے کوئی تحفظ نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان کو تقسیم کرنے کا موقع دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ نیز معاشی حیثیت سے بھی پاکستان غیر مناسب ہے"۔

(بحوالہ صدر)

ہندو پریس کا مذاق

ایک طرف تو ہندو زعمایہ مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان ترک کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب سے کام لے رہے تھے، دوسری طرف ہندو پریس اس مطالبہ کا یوں تمسخر اڑا رہا تھا کہ:-

"اسلامی حکومت! اس ایک لفظ میں نہ جانے کتنی دلربا کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ سیدھے سادے مسلمانوں کی آنکھیں اس کی چمک دمک کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ دل بے اختیار اس کی طرف بھاگتا ہے اور دماغ تھوڑی دیر کے لیے اس نام کی لذت سے سرشار ہو کر معطل ہو جاتا ہے۔ ذرا دیر کے بعد!! یہ سوالات اٹھتے ہیں کہ یہ اسلامی حکومت کیسی ہو گی؟ حجازی قسم کی؟ یا عباسی قسم کی؟ یا ہندی مغلئی قسم کی؟ پھر یہ سوالات اٹھتے ہیں کہ وہاں سنّی فقہ چلے گی یا شیعہ فقہ؟ اور سنّی فقہ حنفی ہو گی یا حنبلی؟ اسی طرح بہت سے سوالات!!!"

جوابِ ماجد انگریزی معاصر کا مندرجہ صدر اقتباس پیش کرنے کے بعد حضرت تھانویؒ کے فیض یافتہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے جن کے سامنے سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے نظریہ پاکستان پیش کیا تھا، اس کے اندیشوں اور پریشانیوں کا یہ جواب دیا اور خوب دیا کہ :-

"الزامی جوابات (مثلاً یہ کہ سوراجی حکومت کس کے خیالات کے مطابق ہو گی؟ گاندھی جی کے اصول کے یا پنڈت جواہر لال نہرو کے نقشہ کے یا سوبھاش چندر بوس کے نظریات کے مطابق ؟ وقس علیٰ ہٰذا) سے اگر قطع نظر کر لی جائے۔ جب بھی پیش کردہ سوالوں کا جواب بہت ہی آسان ہے کہ اسلامی حکومت اپنی بد تر سے بد تر شکل میں اور کسی فرقہ کی فقہ کے مطابق بھی سہی، بہرحال ہر کافرانہ حکومت سے بہتر و قابل ترجیح ہو گی۔ صحت کمزور سے کمزور سہی بہر حال بیماری کی ہم سطح تو نہیں ہو سکتی۔ روشنی دھیمی سے دھیمی سہی، بہر حال تاریکی سے تو غنیمت ہی رہے گی"۔ (صدق ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء)

یومِ فتح مرکزی انتخابات کی جنگ شروع ہونے سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو نے ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اپنے زورِ بازو کا یوں اعلان کیا تھا کہ :-

اگر ہم نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا تو ہم ان کی پوری تیاری کریں گے اور جو کوئی ہماری مخالفت کرے گا، ہم اسے کچل دینگے۔ ہم اپنے بنیادی اصولوں کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ہم لڑنا جانتے ہیں۔ ہم نے حکومتِ برطانیہ سے بھی لڑائی کی ہے"۔ (حیات محمد علی جناح صفحہ ۱۲۱)

پنڈت نہرو کو اپنی قوتِ قاہرہ پر ناز تھا اور قائدِ اعظم کو اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ اس مردِ مومن نے اس اعلانِ مبارزت کا ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اپنی تقریر میں یہ جواب دیا کہ

"اگر حکومت اور کانگریس نے اپنے اثر و رسوخ کا ناجائز استعمال نہ کیا تو ہم کانگریس کے مقابلہ میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوں گے۔ مگر کانگریس روپیہ پیسہ کے بل بوتے پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ ہم کامیاب ہوں گے۔"

(بحوالہ صدر ص۱۹)

نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کو شکستِ فاش اور مسلم لیگ کو سو فیصدی کامیابی نصیب ہوئی قائدِ اعظم نے حق تعالیٰ کے اس فضلِ خاص کا شکر ادا کرنے کے لیے یومِ فتح منایا اور ۱۱؍ جنوری ۱۹۴۶ء کو اس تقریبِ سعید کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کی سو فی صدی کامیابی کی مثال کسی ملک اور کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ہٹلر اور مسولینی جیسے ڈکٹیٹر بھی ایسی شاندار فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے جیسی کہ آج ہم کو نصیب ہوئی ہے۔ اس انتخاب نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلم عوام مسلم لیگ کے ساتھ ہیں"۔ (ایضاً ص۱۹)

سردار پٹیل کا چیلنج

قائدِ اعظم کی یہ تقریر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ جس نے سردار پٹیل جیسے مردِ آہن کا دماغی توازن بگاڑ دیا اور انہوں نے یومِ فتح والی تقریر کا جواب دیتے ہوئے ۱۴؍ جنوری ۱۹۴۶ء کو احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ الٹی میٹم دیا:۔

"مرکز میں مسلم لیگ تمام مسلم نشستوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

اب بے شک یہ جماعت یوم فتح منا رہی ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ ہم نے پاکستان لے لیا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ پاکستان اس طریقہ پر حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ پاکستان حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر پاکستان کا قیام عمل میں لانا منظور رہے، تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہونا ہوگا اور اس صورت میں خانہ جنگی ہو کر رہے گی۔
صوبائی انتخابات وسیع حق رائے دہی کی بنیادوں پر لڑے جائیں گے۔ کانگریس فیصلہ کر چکی ہے کہ ہر غیر مسلم نشست کا مقابلہ کرے گی اور زیادہ سے زیادہ مسلم نشستوں کے لیے بھی اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔
ہم دیکھیں گے کہ پاکستان کس طرح قائم ہوتا ہے اور مسلم لیگ کس طرح یوم فتح مناتی ہے۔" (ایضاً ص۲۶)

قائداعظم کی تیاری

یہ متوکل مردِ مومن کفر کی قوت کے ساتھ کس ساز و سامان سے صوبائی انتخابات کی جنگ جیتنے کا پروگرام بناتا ہے؟ اس کا جواب ان کی ۷ار جنوری ۱۹۴۶ء والی تقریر سے ملتا ہے۔ جو انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فرمائی کہ:-

"انتخابات کے دنوں میں ہم پٹرول اور گاڑیوں کا انتظام نہ کر سکیں گے اس لیے طالب علموں کو میرا یہ پیغام ہر ووٹر تک پہنچا دینا چاہیئے کہ وہ رائے دہی کے اڈوں تک پیدل آئے اور ووٹ دینے کی زحمت گوارا کرے"۔ (ایضاً ص۸۰)

مودودی صاحب کی مخالفت

پاکستان کے خلاف سردار پٹیل نے مسلم لیگ کو جو مذکورہ بالا چیلنج دیا اس کی تائید

مودودی صاحب نے ماہ فروری ۱۹۴۶ء میں ان الفاظ میں کی :۔

"مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دور تر لیے جا رہی ہے" ۔ (ترجمان القرآن جلد ۲۸ نمبر ۲ صہ ۱۵۹)

"جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہونگے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہو گی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے"۔ (ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء)

گویا قائداعظم نے ۱۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کو صوبائی انتخابات میں کامیاب کرانے کی جو تجویز پیش کی تھی، مودودی صاحب نے اس کی اسلام کے نام پر مخالفت کی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کو اسلام سے دور لے جا رہی ہے اور پاکستان طلب کرنے والے یا اس کی جنگ لڑنے والے سب جنت الحمقاء کے رہنے والے ہیں ۔ یہ پاکستان کا اقتدار سنبھالنے کے خواب دیکھنے والے مودودی صاحب کا دوسرا تاریخی کارنامہ تھا۔

مخالفین کی کوششیں

کانگریس ہائی کمان نے مسلم لیگ کی مخالفت کا شعبہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد کر رکھا تھا، جنہوں نے مجلس احرار، جمیعتہ العلماء ہند، جماعت اسلامی، نیشلسٹ کانفرنس اور خدائی خدمتگاروں غرضیکہ ہر اس جماعت سے جو مسلم لیگ کی مخالفت میں پیش پیش تھی، اپیل کی کہ وہ :۔

"منظم ہوکر ایک وجود بن کر ڈٹ کر مسلم لیگ کا مقابلہ کریں"۔

اس اپیل کا جواب اس طرح دیا گیا :۔

(الف) مولانا ابوالکلام آزاد کے شاگرد رشید اور دیرینہ رفیق کا مدیر روزنامہ "ہند" کلکتہ کا ۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کا مقالہ اشتہاروں اور ٹریکٹوں کی صورت میں شائع کیا گیا جس میں قائد اعظم کو یزید سے تشبیہہ دی گئی اور مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی و دیگر اکابر جمیعۃ علماء اسلام سے سوال کیا گیا کہ :۔

"لیگ والے "علماء اسلام" ارشاد فرمائیں کہ حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ اور کوئی مسلمان جو یزید کے مخالف اور مسلمانوں کی واحد جماعت سے الگ تھے سچے مسلمان تھے یا اسلام سے باہر ہو چکے تھے۔ حق پر تھے یا معاذ اللہ جہنم کی راہ پر چل رہے تھے ؟ کیونکہ یزید کے ساتھ مسلمانوں کی جو جماعت تھی اور جس میں تقریباً سبھی مسلمان شریک تھے۔ وہ صرف دو کے علاوہ باقی سب صحابہ کی شرکت کی وجہ سے مسلم لیگ کی جماعت سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی جماعت تھی اور یہ یزیدی جماعت مسلم لیگ کی جماعت سے کہیں اعلیٰ و افضل تھی"۔

(ب) جماعت احرار نے قائد اعظم کو کافر اعظم ثابت کرنے کے لیے اس مضمون کے اشتہار در و دیوار پر چسپاں کیے کہ :۔

"لیگ کے قائد نے ۱۹۱۲ء میں سول میرج ایکٹ کے مطابق جو شادی ایک کافرہ سے کی تھی، اس میں اپنی لا مذہبیت کا اعلان کر دیا تھا اور اب تک انہوں نے اپنا مسلمان ہونا ثابت نہیں کیا[۱]"

---

[۱] حالانکہ یہ بہتان سراسر غلط تھا۔ قائد اعظم نے مس رتن پٹیٹ سے سول میرج ایکٹ کے

(ج) امارت شرعیہ بہار کے مبلّغوں نے کانگریس کی حمایت میں مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا ایک پروگرام بنایا۔ جس کا عکس روزنامہ "تنویر" لکھنؤ نے اپنی ۲ جنوری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ اس میں درج تھا کہ:-

"مخالف ووٹروں کو توڑنے کے لیے اگر ضرورت ہو تو قبائلی اور نسلی بنیاد والی اصلاحی تحریکوں کی بھی تبلیغ کی جائے۔ جیسے جمعیۃ المؤمنین، جمعیۃ الراعین، جمعیۃ المنصورین وغیرہ۔ ہر ورکر کی تھوڑی بہت ٹریننگ ضروری ہے۔ ان کو چند ایسی موٹی موٹی باتیں سکھلا دی جائیں۔ جن کو دیہات کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور اس کے نتیجہ میں لیگ سے متنفر ہو جائیں۔ مثلاً یہ کہ لیگ آزادی کی راہ میں روڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۶ء سے اب تک گورنمنٹ نے لیگ کو اپنا دشمن نہیں سمجھا، نہ لیگ کو خلافِ قانون جماعت قرار دیا۔"

(د) جماعت اسلامی کی طرف سے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصّہ سوم کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) ما تحت شادی نہیں کی تھی۔ بلکہ شادی کرنے سے پہلے:-

"انہوں نے اپنی ہونے والی رفیقہ حیات کے سامنے اسلام پیش کیا اور صاف صاف کہہ دیا۔ شادی اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں کا جہاں دل ایک ہے۔ مذہب بھی ایک ہو۔ اللہ کی اس نیک بندی نے بلا تامل اسلام قبول کیا اور چند مخصوص دوستوں کی موجودگی میں تقریبِ نکاح اتمام تک پہنچی۔ مسٹر شریف دیوجی کانجی نے اثنا عشری قاضی کا انتظام کیا۔ اس شادی کی خبر سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۱۸ء نمبر ۹ صفحہ ۲ کالم ۴ میں بعنوان "قبول اسلام" شائع ہوئی۔"

(حیات محمد علی جناح صفحہ ۸۷، صفحہ ۸۸)

تیسرا باب "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"۔ الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے عوام میں تقسیم کیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ پاکستان کی :-

"جو تجویز کی جارہی ہے اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصہ حصّہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ الٹا قدم ہے"۔ (ص ۱۹)

طوفانی دورے

یہ وہ حالات تھے جن میں قائد اعظم اور مسلم لیگ کو صوبائی انتخابات لڑنے پڑے۔ اگرچہ اس وقت ان کی پشت پر بڑے بڑے علماء کرام، مشائخ عظام، نوجوان طلباء اور عوام تھے۔ مگر کانگرسی علماء کے مقابلہ میں علمائے اسلام کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ انگلیوں پہ گنی جا سکتی تھی۔ پھر ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید اور مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ کا توڑ علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی وغیرہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس لیے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے یہ گوشہ نشین بھی اپنی خانقاہوں سے باہر نکل آئے اور جس طرح قائد اعظم بہ نفسِ نفیس سندھ، سرحد، پنجاب کا دورہ کر رہے تھے۔ اسی طرح انہوں نے بھی ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے شروع کر دیئے اور اپنے ہم مشرب علماء اور مشائخ کی معیت میں اسلامی ہند کے تنِ مردہ میں اپنی مجاہدانہ تقریروں سے قوتِ حیات پیدا کرنے لگے۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ ان حضرات کے دورہ کا پروگرام روزنامہ اخبار "منشور" اور "ڈان" میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ جلسوں اور کانفرنسوں کا انتظام جمعیۃ علماء اسلام اور

مسلم لیگ ہر جگہ کرتی تھی اور یہ حضرات ہر روز ایک نہیں، دو دو، تین تین جلسوں میں تقریر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے ساتھ تو ان کا کوئی رفیق نہ جا سکا۔ مسلسل سفر کی صعوبت اور شب بیداری کی وجہ سے وہ اکثر بیمار ہو جاتے اور مولانا کو بعض مقامات پر تنہا جانا پڑتا۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ ان کے بڑھاپے میں بھی ان کی صحت ان کا برابر ساتھ دیتی رہی۔ یہ جہاں بھی پہنچتے، ان کی بے غرضانہ اور مخلصانہ آواز پر عوام لبیک کہتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رخ بدل جاتا۔ جس کا خود قائد اعظم کے ایک روحانی رفیق نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۶ر جنوری ۱۹۴۶ء میں یوں اعتراف کیا کہ :-

"کل سے یہاں (لاہور میں) جمعیۃ علماء اسلام کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، حضرت مولانا قاری محمد طاہر صاحب دیوبندی، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دیوبند اور بیسیوں حضرات علماء کرام تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلم لیگ کی بڑی شد و مد سے حمایت کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کی آمد سے ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔" (مشاہدات و واردات ص ۲۰۹)

چار ماہ کی مسلسل تگ و دو کا یہ نتیجہ نکلا کہ عامۃ المسلمین متحدہ قومیت کا مورچہ فتح کرنے کے لیے مردانہ وار میدان میں نکل آئے۔

مجدد کی تلوار

اسی جدوجہد کے زمانہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ کے ایک صالح دوست نے انہیں خط لکھا۔ جس میں درج تھا کہ :-

"میں نے خواب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دیکھا جو مجھے ایک چمکدار تلوار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں کہ "عزیزم تم دیوبند جا رہے ہو۔ میں تمہیں

یہ تلوار دیتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر میرا یہ تحفہ بعد سلام مسنون شبیر احمد عثمانی کو دے دینا" اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ علامہ عثمانی نے یہ واقعہ سُنا کر فرمایا کہ بھائی مسلم لیگ کی فتح یقینی ہے۔ یہی وہ مجددی تلوار ہے۔ جس سے اکبر کی قومیت متحدہ اور دین الٰہی کو فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اب انشاء اللہ العزیز اسی مجددی حربہ سے کانگرس کی قومیت متحدہ اور گاندھی ازم کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیں گے"۔ (حیات شیخ الاسلام صہ ۴۳)

شاندار کامیابی

جناب رئیس احمد جعفری حیات محمد علی جناح میں لکھتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی مرکزیت اور تنظیم کو توڑنے کے لیے:۔

"کانگرس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مجلس احرار کے واعظانِ آتش مقال اور علمائے شیوہ بیان دَورہ پر نکل کھڑے ہوئے۔ دیوبند کے وہ طلباء اور علماء جو مولانا حسین احمد صاحب سے متاثر تھے، تبلیغ و تلقین کے لیے شہر شہر، قریہ قریہ کا گشت کرنے لگے۔ جہاں دال گلتی نہ دیکھی' وہاں مولانا آزاد نے پر پرواز پیدا کیے اور طیارے میں بیٹھ کر تفریق بین المسلمین اور تضعیف شوکتِ مومنین کا غیر فانی اور لازوال کارنامہ انجام دینے کے لیے اُڑ کر پہنچ گئے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ ملت اسلامیہ نے جواب کیا دیا؟ قوم کا فیصلہ کیا رہا؟ واقعات کا جواب یہ ہے کہ تن تنہا مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور دوسری مسلم جماعتیں ناکام و نامراد رہیں"۔

ہندو راج کی بنیاد

صوبائی انتخابات کے نتائج سے ہندو قوم کا دماغی توازن قائم نہ رہا۔ اگر اس کی نیت نیک ہوتی اور اس کا دماغی توازن قائم رہتا رہتا، تو جن صوبوں میں انہوں نے عنانِ حکومت سنبھالی تھی، وہاں مسلمانوں سے ایسا فراخدلانہ

سلوک کرتے کہ لوگ پاکستان کا نام تک لینا بھول جاتے۔ مگر کہتے ہیں کہ ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

بھارت ماتا کے گلے پر پاکستان کی چھری چونکہ چلنی تھی، اس لیے ہندوؤں نے وہاں مسلمانوں پر انتہائی مظالم توڑ کر اس چھری کو تیز کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۵ رجون ۱۹۴۶ء کو جب وزارتی مشن کی سفارشات پر غور کرنے کے لیے امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں کل ہند مسلم لیگ کونسل کا اجلاس شروع ہوا۔ تو قائداعظم نے اس اجلاس میں اپنی غیر فانی تقریر کرتے ہوئے ہندوؤں کے ظلم و استبداد کے متعلق فرمایا کہ:۔

"اس کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ پاکستان ہے۔ جب پاکستان قائم ہو جائے گا تو ہندوؤں کا زاویہ نگاہ بدل جائے گا۔ اس وقت بدقسمتی سے ہندوؤں کے دماغ میں ہوا بھری ہوئی ہے اور جہاں کہیں کانگرس وزارت بنی وہاں ہندو راج قائم ہو گیا۔ چنانچہ ایسے مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جس وقت انسان دیوانگی کی حالت میں ہو، تو پاگل خانہ ہی اس کی صحیح جگہ ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے ہندو ہندی ظالم اور تکلیف دینے والا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سب جاتا رہے گا اور اگر یہ نہ کیا گیا تو پھر اسے ٹھیک کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔"

(منشورات قائداعظم)

اس تقریر کا آخری فقرہ اس بات کا غماز ہے کہ قائداعظم جیسا بردبار، متحمل مزاج انسان بھی ہندو استبداد سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ وہ آئینی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ بشرط ضرورت جہاد کرنے کی فکر میں تھا۔ صرف قائداعظم ہی نہیں بلکہ وہ ارباب مسلم لیگ جو بقول جمیعۃ العلماء ہند و جماعت اسلامی بے دین، رجعت پسند، کاسہ لیس اور انگریزوں کے پٹھو تھے۔ ہندوؤں

کے ظلم و ستم سے اتنے بے تاب ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قوم کے لیے ایک باعزت مقام حاصل کرنے کی خاطر قربانی دیتے ہوئے اپنے آقایانِ ولی نعمت کے عطا کردہ اعزازات و خطابات کا جوا اپنی گردنوں سے اتار دیا اور حصولِ پاکستان کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے میدانِ جہاد میں اتر آئے۔ اس ساعتِ سعید کے لیے ہمیں ہندو سیاستدانوں کا مشکور ہونا چاہیے کہ جس طبقہ کو آج تک کوئی راست اقدام کی حد تک نہ لا سکا تھا، ہندو قوم کی غلط کاریوں نے اور ہندو قوم کی ستم رانیوں نے انہیں مجاہدین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور جہاد کی آیات پڑھنے والے ظلم و ستم کی اعانت میں مصروف رہے۔

انتقالِ اقتدار

ان حالات سے برطانیہ کے ایوانِ حکومت میں ایک زلزلہ سا آ گیا اور مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے جون ۱۹۴۷ء تک حکومتِ ہند کی عنانِ اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دے کر یہاں سے بوریہ بستر کوچ کرنے کا اعلان کر دیا۔

نئے حالات کا جائزہ لینے اور ایک آخری فیصلہ پر پہنچنے کے لیے ۹ رجون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں مشترک ہندوستان کی اسمبلی کے مسلم ممبران کا ایک اہم اجتماع ہوا اور اس میں شرکت کیلئے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) کو خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ پورے غور و خوض کے بعد اس اجتماع نے پاکستان قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس سے تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

شبیر جناح ملاقات

۱۱ رجون کو علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی جنگ پاکستان جیتنے کی مبارکباد پیش کرنے کے لیے قائد اعظم کی کوٹھی پر پہنچے۔ جونہی یہ خدامِ دربارِ اشرفیہ قائد اعظم کے کمرہ میں داخل ہوئے، انہوں نے سروقد کھڑے ہو کر ان کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ مصافحہ کے بعد اپنے

پاس بٹھلایا۔ اس وقت کمرہ میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے علاوہ اور کوئی آدمی موجود نہ تھا جو ترجمان کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے قائدِ اعظم کو حصولِ پاکستان پر مبارک باد پیش کی، تو قائدِ اعظم نے فرمایا کہ :۔

"مولانا یہ مبارک باد آپ کو ہے کہ آپ کی ہی کوششوں سے یہ کامیابی ہوئی ہے"۔

اس کے بعد دوسری باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قائدِ اعظم ان حضرات کی باتیں بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ سنتے رہے اور مناسب موقع جواب دیتے رہے۔

خدامِ اشرفیہ کے مطالبات

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :۔

"بدورانِ گفتگو ہم نے قائدِ اعظم سے دو سوال کیے۔ ایک یہ کہ جس صورت میں آپ نے پاکستان منظور کیا ہے، یہ اس قرارداد کے خلاف ہے، جو اب تک آپ نے ظاہر کی تھی کہ پورا پنجاب اور پورا بنگال پاکستان میں شامل ہوگا۔ اس کی تقسیم در تقسیم سے پاکستان چھوٹا رہ جائے گا۔ جس میں دس کروڑ مسلمانوں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دوسرے آپ نے اڑھائی مہینہ کے بعد یعنی ۱۴ اگست کو پاکستان لینا منظور کیا ہے۔ اڑھائی مہینہ میں تو ایک گاؤں بھی تقسیم نہیں ہو سکتا، پورا ملک کیسے تقسیم ہو جائے گا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ۱۴ اگست کو آپ کے ہاتھ میں صرف پاکستان کا پروانہ ہوگا۔ پاکستان کے حصہ کا سامان وغیرہ کچھ نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں کم از کم اڑھائی سال تک یہی صورت حال رہے، جواب ہے۔ آپ اس عرصہ میں دہلی میں قیام رکھیں اور اپنے پورے حصہ پر قبضہ کر کے دہلی چھوڑنے کا نام لیں۔

قائداعظم کی وضاحت

قائداعظم نے پہلے سوال کا یہ جواب دیا کہ انگریز اور کانگرس کی زبان پر پاکستان کا نام ہی نہ آتا تھا۔ اب خدا خدا کر کے ہندوؤں کی زبان پر یہ آیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کر دی جاوے، تو پاکستان منظور ہے۔ میں نے اس کو منظور کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اس کو ہرگز منظور نہ کروں گا اور پاکستان یونہی رہ جائے گا۔ میری منظوری سے وہ دم بخود رہ گئے اور انکار نہ کر سکے۔ پھر یہ صورت اس لیے بھی اچھی ہے کہ جب ہندو پاکستان میں کم ہوگا تو ہمیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی، ورنہ مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت سے ہمیشہ پریشانی پیش آتی۔

ہمارے دوسرے سوال کا قائداعظم نے یہ جواب دیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت جلدی کر رہا ہے۔ امید ہے کہ پاکستان کا حصہ اٹھائی مہینہ میں ہی ہم کو مل جائے گا۔ پھر برطانیہ ۱۵ اگست تک ہندوستان کو آزاد کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ اگر ہم اس وقت تک پاکستان نہ لیں گے تو وہ ہندوستان کانگرس کے حوالے کر کے چلتا بنے گا اور یہ ہمارے واسطے بہت مضر ہوگا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

ہم نے پھر سوال کیا کہ پاکستان بن جانے کے بعد اُن مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا، جو ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ ہماری مسجدوں اور خانقاہوں کا کیا بنے گا؟ کہنے لگے کہ جو حال پاکستان میں ہندوؤں کا ہوگا، وہی ہندوستان میں مسلمانوں کا ہوگا۔ ہم ان کو پریشان نہ کریں گے، بلکہ امن و امان سے رکھیں گے۔ وہ مسلمانوں کو تنگ نہ کر سکیں گے۔ ہم نے کہا کہ ہم تو اپنی مذہبی روایات کی بناء پر اقلیت کے ساتھ بہتر سلوک

کریں گے، مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے، کہنے لگے کہ جو ہندو ہمارے ماتحت ہوں گے، وہی ان مسلمانوں کی راحت کی گارنٹی ہوں گے۔ وہ خود ہندوستانی حکومت کو مجبور کریں گے کہ جس طرح ہم پاکستان میں ہیں، اسی طرح تم بھی مسلمانوں سے اچھا سلوک کرو، ورنہ ہمارا پاکستان میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔

ریفرنڈم کی فکر اس کے بعد قائداعظم نے از خود فرمایا کہ مولانا مجھے تو اس وقت بڑا فکر سلہٹ اور فرنٹیئر کے ریفرنڈم کا ہے اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا، تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ہم نے کہا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس ریفرنڈم میں پاکستان کامیاب ہو جائے؛ اس پر قائداعظم آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور سلہٹ کا علاقہ بھی مشرقی پاکستان کے لیے ایسا ہی ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو۔

وفد کی شرط ہم نے کہا کہ ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہوگا، بشرطیکہ آپ اعلان کر دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہوگا اور اس کا دستور اسلامی ہوگا۔ کیونکہ فرنٹیئر اور بنگال کا مسلمان سیاسی مصالح کو نہیں جانتا۔ وہ صرف اسلام کو جانتا ہے اور اسی کے نام پر ووٹ دے سکتا ہے۔ کہنے لگے کہ مولانا! میں تو اس کا بارہا اعلان کر چکا ہوں اور جب پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، تو وہاں اسلامی دستور کے سوا اور کون سا دستور ہو سکتا ہے؛ آپ بخوشی اپنی تحریر و تقریر میں میرے

حوالے سے اس کا اعلان کرتے رہیں اور ان کو پورا اطمینان دلائیں کہ ہیں نے قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ جو میں نے پہلے بارہا کہا ہے، وہ میں آج بھی کہتا ہوں کہ پاکستان کا نظامِ حیات اسلامی ہوگا اور اس کا دستور کتاب و سنت کے موافق ہوگا۔ اس پر میں نے کہا۔ میں انشاءاللہ سلہٹ کا محاذ سنبھالوں گا اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے فرنٹیئر کے محاذ کا وعدہ کیا۔ اس پر قائداعظم کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور کھڑے ہو کر ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو اور آپ کے ذریعہ سے پاکستان کو کامیاب کرے۔"

پختونستان کی سازش

اس ملاقات کے وقت تک دنیا پختونستان کے لفظ سے اسی طرح ناآشنا تھی، جس طرح کسی زمانہ میں پاکستان کے لفظ سے۔ چنانچہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور اپنی اشاعت مورخہ ۱۸ راگست ۱۹۵۵ء کے افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ :۔

"جب تک انگریز نے پاکستان کا مطالبہ منظور نہیں کیا تھا۔ سرحدی گاندھی یا بلوچستانی گاندھی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہیں کیا نہ کبھی یہ مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد کا نام پختونستان رکھ دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ متحدہ ہندوستان اور مضبوط مرکزی حکومت کے حامی رہے۔ اس متحدہ ہندوستان میں صوبہ سرحد کی حیثیت چودہ پندرہ صوبوں کے ملک میں ایک چھوٹے سے صوبہ کی ہوتی اور اس متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں اقتدار ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوتا۔ سرحدی گاندھی کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے، مرکز میں ہندوؤں کا اقتدار ہو اور صوبہ سرحد کے غیور مسلمان ہندوؤں کے زیرِ نگین ہوں۔ مگر جب انگریز اور

کانگرس دونوں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا اور یہ طے ہو گیا کہ اب ہندوستان تقسیم ہو کر رہے گا، تو پہلی مرتبہ سرحدی گاندھی نے پختونستان کا نعرہ بلند کیا۔"

چنانچہ مذکورہ بالا شبیر جناح ملاقات کے تقریباً ایک ہفتہ بعد کانگرسی لیڈروں نے ریفرنڈم جیتنے کے لیے پختونستان کی تحریک شروع کر دی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل رپورٹ سے ظاہر ہے جو روزنامہ "آزاد" لاہور و "انصاری" دہلی مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۷ء میں چھپی :۔

"پشاور۔ ۲۲ جون۔ خان ملک اکبر علی خاں آف بنوں کی دیہی قیامگاہ پر سرحد کی کانگرس پارٹی، خدائی خدمتگار، صوبائی کانگرس پارلیمنٹری پارٹی اور زلمی پختونوں کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی۔ جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے گا۔ جس کا دستور اسلامی جمہوریت پر مبنی ہو گا اور جس میں مساوات اور سماجی انصاف کو مدنظر رکھا جائے گا۔ یہ جلسہ پانچ روز تک جاری رہا۔ جس میں صوبہ کے پانچ سو نمائندوں نے شرکت کی۔ آزاد پختونستان (آزاد قبائل) سے وزیر، محسود اور پٹھانوں نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت خان امیر احمد خان صدر کانگرس کمیٹی صوبہ سرحد نے کی۔ یہ جلسہ خان ملک اکبر علی خان کے مکان واقع سوکڑی ضلع بنوں میں منعقد ہوا تھا۔" (اپ)

ہندوؤں کے ارادے

ہندوستان میں رام راج قائم کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا اس میں افغانستان کو بھی شامل کر دیا گیا تھا کیونکہ ہندوؤں کے خیال کے مطابق افغانستان کسی زمانہ میں بھارت کا ہی حصہ تھا۔ اس لیے جب کبھی ہندوؤں کی آزادی کا ذکر آتا، وہ افغانستان کو بھی ضرور یاد کرتے۔ جیسا کہ دشمن اسلام لالہ ہردیال کے اس بیان سے ظاہر ہے اور جس پر اس وقت ہندوستان و افغانستان میں عمل

ہو رہا ہے کہ :۔

"پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ نہ صرف ہندو راج قائم ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کی شدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے"۔ (روزنامہ ملاپ لاہور، ۱۲ر جون ۱۹۲۵ء صفحہ ۹)

اس کی تائید پنڈت جواہر لال نہرو کی ۸ر جنوری ۱۹۴۶ء والی تقریر سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے پاکستان چاہنے والوں کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ :۔

"پاکستان کو دوسری قومیں ہضم کر لیں گی، کیونکہ چھوٹی قوموں کے لیے کوئی تحفظ نہیں ہے"۔

بالفاظ دیگر ہندو لیڈر پاکستان بننے سے پہلے ہی اسے ہضم کرنے کا منصوبہ بھی تیار کر چکے تھے جس کا زندہ ثبوت ریڈ کلف ایوارڈ کا ریفرنڈم، حیدرآباد کا سقوط اور جوناگڑھ وغیرہ پر غاصبانہ قبضہ ہے ۔

سلہٹ اور فرنٹیئر دونوں مسلم اکثریت کے صوبے تھے ۔ وہاں ریفرنڈم کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ لیکن چونکہ سلہٹ میں ایک عرصہ سے مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہر سال رمضان شریف گزارتے، وہیں اعتکاف کرتے، تراویح میں قرآن شریف سناتے اور تراویح کے بعد درس قرآن دیتے اس لیے اس علاقہ میں ان کے مریدین بکثرت پیدا ہو گئے تھے ان کا وہاں بہت ہی اثر و رسوخ تھا اور وہ سارا علاقہ ان ہی کے اشارہ چشم و ابرو پر چلتا تھا

دوسری طرف فرنٹیئر میں عرصہ سے سرخپوش تحریک چل رہی تھی ۔ خدائی خدمتگار سارے صوبہ سرحد میں پھیلے ہوئے تھے ۔ خان برادران کی حکومت ہونے کی وجہ سے سارا صوبہ ان کے زیر نگین تھا اور انہیں کا وہاں طوطی بول رہا تھا ۔

اس لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ذاتی دوست دشمنِ پاکستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی معرفت ریڈ کلف کو شیشہ میں اتار کر ان ہر دو صوبوں میں ریفرنڈم رکھوا دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور خان برادران کی مدد سے انہیں ہندوستان میں شامل کرا کر پاکستان کو لنگڑا لولا کر دیں گے اور اگر خدانخواستہ ریفرنڈم کا نتیجہ ان کے حق میں نہ نکلا تو پختونستان کا سوال پیدا کر کے پاکستان کو صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ سے محروم کر دیں گے۔ یہ دونوں علاقے چونکہ افغانستان سے ملحق تھے، جہاں ہندوستان کی نسبت افغانستان کی ریشہ دوانیاں زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس لیے افغانستان کی امداد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اسے یہ حکمہ دے رکھا تھا کہ وہ پختونستان کا الحاق افغانستان سے کرا دیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے اعلانات بھی کرنے شروع کر دیے تھے اور سرحد کی کانگرسی وزارت کے وزیر مال اور سرحدی گاندھی کے سمدھی "قاضی عطاء اللہ" نے صاف کہہ دیا تھا کہ :۔

"پٹھان فطری طور پر آزاد واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے آزاد فطرت ہونے کی وجہ سے وہ افغانستان میں شامل ہونا پسند نہ کریں گے۔ لیکن اگر بعد میں انہیں کسی وجہ سے کسی میں شامل ہونا پڑا، تو پاکستان کے مقابلہ میں افغانستان کو ترجیح دیں گے"۔

(انصاری۔ دہلی ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء)

ریفرنڈم کی مہم

یہ وہ حالات تھے جن میں مسلم لیگ کو ریفرنڈم لڑنا تھا اور جن کی وجہ سے قائدِ اعظم اتنے پریشان تھے کہ وہ علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی سے ریفرنڈم جیت دینے کی درخواست کرتے وقت آبدیدہ سے ہو گئے تھے اور جس کا انہوں نے اللہ جل شانہٗ کے بھروسہ پر جیت دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگرچہ ان دونوں بوڑھے جرنیلوں کو یقین تھا کہ وہ اسلام کے نام پر یہ دونوں محاذ جیت لیں گے۔ مگر حق تعالےٰ نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں اس متوقع فتح کی بشارت بھی دے دی تھی۔

بشارت غیبی

عین اس زمانہ میں جب کہ ریفرنڈم کے محاذوں پر جلد از جلد پہنچنے کے لیے اسلام کے ان ہر دو خادموں کے نام نوابزادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، شہید حسین سہروردی کے تار پر تار آرہے تھے۔ ایک بزرگ نے خواب دیکھا، جو انہوں نے ان الفاظ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے گوش گزار کیا کہ:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ ——— کا جنازہ تھانہ بھون میں خانقاہ کے اندر مولانا ومرشدنا حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے سامنے لایا گیا۔ میں اس وقت اپنے کمرہ میں کسی کام میں مشغول ہوں۔ حضرت مرحوم نے حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ ظفر احمد کہاں ہیں؟ ان کو کہو کہ نماز جنازہ پڑھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ جس کے بعد میں بیدار ہو گیا۔" علامہ عثمانی نے یہ خواب سنتے ہی فرمایا کہ انتخابات کی طرح دونوں ریفرنڈم بھی ہم انشاء اللہ جیت لیں گے۔" (حیات شیخ الاسلام صہ۴۲)

مخالفین کا پروپاگنڈا

جہادِ پاکستان کے خلاف جماعتِ اسلامی یہ پروپاگنڈا بھی کرتی رہی تھی کہ:۔

"جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں۔ لیکن آزاد پاکستان، اگر فی الواقعہ وہ بنا بھی' تو لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔ جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں

گے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جاسکے"۔ (ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۴ تا صفحہ ۵۵)

ریفرنڈم کی مہم سر کرنے کے لیے جب علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی سرحد اور سلہٹ پہنچے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جس بات کا ڈھنڈورہ جماعت اسلامی پیٹ رہی تھی، دونوں صوبوں میں بالکل انہی بنیادوں پر کانگرسی پروپاگنڈا جاری ہے کہ "پاکستان میں لازمی طور پر اسمبلی ہوگی۔ اسمبلی میں ہندو بھی ہوں گے۔ وہاں دستور اسلامی کس طرح نافذ ہوگا اور جب دستور اسلامی نافذ نہ ہوگا، تو پاکستان دار الاسلام کیسے بنے گا؟" خان برادران تو سینہ پر ہاتھ مار کر یہاں تک کہہ رہے تھے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار ہرگز اسلامی آئین نہیں بنائیں گے۔ اس کی تردید میں قائد اعظم نے جولائی ۱۹۴۷ء میں مسلمانان سرحد کے نام ایک پیغام جاری کیا، جس میں درج تھا کہ:۔

"خان برادران نے یہ زہریلا پروپاگنڈا شروع کیا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت اسلامی کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دے گی۔ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سراسر جھوٹ اور فریب ہے"۔

ادھر علامہ عثمانی اور مولانا عثمانی نے ان کے اس جھوٹ اور فریب کا تار پود بکھیرنے کے لیے دیگر علماء کرام کے ساتھ ہر دو صوبوں میں شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر عوام کو یقین دلایا کہ ہندو اقلیت دستور اسلامی کے نفاذ کو قطعاً نہیں روک سکتی۔ کیونکہ وہ پاکستان کا مطلب خوب سمجھتی ہے کہ وہ دار الاسلام ہی ہوگا۔ جو ہندو پاکستان میں رہیں گے

یہ سمجھ کر رہیں گے۔ آخر ایک ہزار سال جو ہم نے نصف عالم پر حکومت کی ہے تو کیا ہمارے زیرنگین کفار نہیں بستے تھے ؟ کیا اس وقت دستور اسلامی نہ تھا ؟ کیا کفار ہمارے دستور اور قوانین سے خوش نہیں تھے ؟ ان ارباب اخلاص کی شبانہ روز مساعی سے عوام مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ ہو گئے جس سے کانگریسی حلقے بوکھلا اٹھے۔

صوبہ سرحد میں چونکہ کانگریسیوں کا اقتدار تھا، اس لیے انہوں نے علماء کرام کو نشانہ ظلم وستم بنانا شروع کر دیا۔ جنہوں نے ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا جس کی وجہ سے بقول علامہ شبیر احمد عثمانی :۔

"پانسو سے زیادہ علماء ومشائخ کو جیلوں میں جانا پڑا اور انہوں نے دوسرے لیڈروں سے زیادہ سختیاں برداشت کیں"۔ (خطبہ صدارت جمیعۃ علماء اسلام کانفرنس ڈھاکہ۔ فروری ۱۹۴۹ء)

اور سلہٹ میں انہوں نے ووٹنگ کے دوران میں گڑبڑ کرنے اور جعلی ووٹ بھگتانے کی سعی ناکام کی جس کی وجہ سے کئی ہندو آفیسروں اور ہندو دیویوں کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔

فتح مبین چونکہ منصوبۂ پاکستان اللہ والوں کی مخلصانہ آرزوؤں کا نتیجہ تھا۔ اس لیے اسے تائید ایزدی حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے ہر میدان میں دشمنانِ پاکستان کی سیاست اور ان کی تدابیر ناکام رہتیں اور مٹھی بھر مخلصین کی جماعت کامیاب وکامران ہوتی۔ چنانچہ جب ریفرنڈم کے بعد ووٹوں کی گنتی ہوئی تو صوبہ سرحد اور صوبہ سلہٹ بھاری اکثریت کے ساتھ پاکستان کے حصے میں آئے جس پر دنیا حیران رہ گئی اور سب نے بالاتفاق علامہ عثمانی اور مولانا عثمانی کو خراج تحسین ادا کیا کہ :۔

"صوبہ سرحد وسلہٹ کے استصواب میں ان ہی کی ذات گرامی کی وجہ سے کامیابی

حاصل ہوئی ہے اور ان ہی کی قربانیوں نے ان دونوں صوبوں کو پاکستان میں شامل کرا کر اسے دُنیا کی پانچویں بڑی مملکت بنایا ہے"۔

اعترافِ خدمات

اگر یہ دونوں صوبے پاکستان میں شامل نہ ہوتے، تو ظاہر ہے کہ پاکستان کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اسی لیے قائدِ اعظم ان کے حصول کے لیے سینہ سپر اور بیقرار تھے اور یہ دونوں ایسے مورچے تھے، جو علمائے کرام کی قیادت کے بغیر فتح ہونے ناممکن تھے۔ اس تاریخی اور شاندار فتح نے قائدِ اعظم کے مشن کی تکمیل کر دی اور جب ۲۷ رمضان المبارک یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ المبارک جشنِ پاکستان منایا جانے لگا۔ تو ملک کی سب سے بڑی ہستی یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علمائے ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو بخشا۔ کراچی میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے تلاوتِ قرآن مجید اور مختصر تقریر کے بعد اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا پرچم آزاد فضا میں لہرا کر دُنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ پاکستانی فوجوں نے پرچم پاکستان کو پہلی سلامی دی اور سب نے مل کر یہ ترانہ گایا کہ:-

"اُونچا رہے نشاں ہمارا"

اور دُنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اسلامی سلطنت کے قیام کی جو آواز سب سے پہلے جون ۱۹۲۸ء میں دربارِ اشرفیہ سے بلند ہوئی تھی، اسی کے خدام نے اگست ۱۹۴۷ء میں اس کی رسمِ افتتاح ادا کی۔

تدوینِ آئین

آتشِ انتقام

۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو علماء کرام، مشائخ عظام، طلبا اور عوام کی مخلصانہ جد و جہد سے وہ پاکستان، جس کے متعلق گاندھی جی کا دعویٰ تھا کہ یہ ہرگز نہیں بنے گا اور اگر بنا تو میری لاش پر بنے گا، حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آگیا۔ اس نے بھارت ماتا کے دونوں بازو کاٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس سے وہ آتشِ انتقام یکایک بھڑک اٹھی، جو سیواجی مرہٹہ سلگا گئے تھے اور جسے کانگریس، ہندو سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ ہوا دے رہی تھی۔ ہندوؤں نے سکھوں کی اعانت سے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو حوالۂ شمشیر و آتش کرنا شروع کر دیا اور ایک طے شدہ سازش کے ماتحت مغربی پاکستان سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ادھر ہندوؤں اور سکھوں کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم سے تنگ آکر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان اور ایمان کی حفاظت کے لیے پاکستان کی طرف آنا شروع کر دیا۔

تاریخی معجزہ

یہ حالات عین اس وقت پیدا کیے گئے، جب کہ ابھی ارکانِ حکومتِ پاکستان نے دفتر بھی نہ لگایا تھا۔ ان کے پاس اس وقت نہ روپیہ تھا، نہ فوج تھی، نہ کوئی سامان اور انتظام تھا۔ دشمنانِ پاکستان کا خیال تھا کہ یہ نوزائیدہ سلطنت

اسی ایک حملہ میں دم توڑ دے گی، مگر وہ اس امر سے بے خبر تھے کہ ع۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

پاکستان کی بنیاد اللہ کے نیک، مخلص اور برگزیدہ بندوں نے رکھی تھی۔ جسے حق تعالیٰ ان کے اخلاص کی یادگار کے طور پر قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے فضلِ خاص سے اس بے سروسامانی کے عالم میں حکومتِ پاکستان کو لاکھوں مہاجرین کو سنبھالنے اور آباد کرنے کی ہمت و توفیق عطا کی۔ جس کی مثال تاریخ اقوامِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی معجزہ تھا کہ جس سے دشمنانِ پاکستان کو سبق حاصل کرنا چاہیے تھا۔ مگر بغض و عناد اور حسد و تعصب نے انہیں کچھ نہ سوچنے دیا اور وہ بدستور پاکستان کی مخالفت میں سرگرمِ عمل رہے۔

انتقامِ قدرت

جناب مودودی صاحب بھی انہی مخالفینِ پاکستان میں سے تھے۔ جو مجاہدینِ پاکستان کے خلاف لکھ رہے تھے کہ:۔

۱۔ "خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیانِ شرحِ مبین، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوباٹی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمانوں کی نظر نہیں"۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص۲۶)

۲۔ "جنت الحمقاد میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان اگر فی الواقعہ وہ بنا بھی، تو لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ ہوگا۔"
(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۴-۵۵)

لیکن جونہی پاکستان بنا اور قتل وغارت شروع ہوا تو "الجہاد فی الاسلام" کے نامور مصنف اور جماعت اسلامی کے صالح امیر نے اپنے دارالاسلام واقعہ بستی جمال پورہ قصبہ پٹھانکوٹ کو اسی ہندو ہوا کے خوف سے جس کا ارباب مسلم لیگ کو طعنہ دیا جارہا تھا۔ بلا مدافعت ہندوؤں کے حوالے کر دیا اور اسی پاکستان میں آکر پناہ لی۔ جس کا مطالبہ کرنے والوں کو "جنت الحمقاد میں رہنے والوں" کا صالح خطاب دیا گیا تھا۔ حالانکہ اصول پرستی کا، جس کی کہ جماعت اسلامی مدعی تھی، مقتضٰی یہ تھا کہ مودودی صاحب اپنی صالح جماعت کے ساتھ اپنے دارالاسلام کو بچانے کے لیے جہاد کرتے، جان تک دے دیتے۔ مگر اس پاکستان کی طرف رُخ نہ کرتے جس کے قیام کے وہ قائل اور مؤید نہ تھے۔

اب بھی عام خیال یہی تھا کہ مودودی صاحب پاکستان کی مخالفت ترک کر کے اس کے استحکام میں ممد ومعاون ہوں گے۔ مگر وہ اسے اپنا مامن ومسکن بنانے کے باوجود اس کی مخالفت سے باز نہ آئے۔ اور اس کے اندر بیٹھ کر اس کے دشمنوں کی اعانت کرتے رہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

شر سے خیر

پاکستان سے ہندو اور سکھ اس کی معیشت کو تباہ کرنے اور اس کی سالمیت کو خطرہ میں ڈالنے کی نیت سے بھاگے تھے، مگر ان کا یہاں سے فرار ہی پاکستان کے استحکام کا باعث ہوا اور مغربی پاکستان ہر قسم کے فرقہ وارانہ فسادات اور ریشہ دوانیوں سے مامون ومصئون ہوگیا اور خود بخود دارالاسلام بن گیا۔ ورنہ یہاں بھی

وہی حالات پیدا ہوتے رہتے، جو ہندو آئے دن مشرقی پاکستان میں پیدا کرتے رہتے ہیں اور جو حکومت کے لیے باعثِ پریشانی اور پاکستان کی سالمیت کے لیے باعثِ خطرہ بنتے رہتے ہیں۔ دراصل اربابِ حکومت نے اس قوم کی دون فطرتی کو نظر انداز کر کے نیک نیتی سے اس کو اس وقت روک لیا، جب کہ وہ ابتداً ہندوستان بھاگ رہے تھے۔ مگر وہ اپنی فطرتی نیش زنی سے نہ رک سکے جس کی وجہ سے وہ آج تک اپنے حقوق کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور خطرہ کا باعث بن رہے ہیں۔

مجلس العلماء متحدہ ہندوستان کے آخری انتخابات اور صوبہ سرحد و سلہٹ کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کو جو تاریخی فتح حاصل ہوئی۔ اس کا سبب یہ نعرہ تھا:۔

"پاکستان کے معنیٰ کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"

چونکہ پاکستان کی بنیاد ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے اصول پر رکھی جا رہی تھی۔ اس لیے جہادِ پاکستان کے دوران میں ہی اللہ کے چند مخلص بندوں نے مذکورہ بالا نعرہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لاہور میں "مجلس العلماء" کے نام سے علماء کی ایک جماعت قائم کر دی تھی۔ جس کا پہلا کام یہ تھا کہ پاکستان قائم ہوتے ہی اپنی پہلی قومی حکومت سے تعاون کر کے علماءِ کی ایک ایسی مجلس قائم کرائے، جو جدید آئین کی بنیادی شکل کے لیے قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں مجلس دستور ساز کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کر دے۔ چنانچہ اس جماعت کے جنرل سیکرٹری جناب شفیق صدیقی صاحب نے اس مجلس کی رکنیت کے لیے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح کی خدمت میں ایک چٹھی لکھی۔

عزمِ عثمانی علامہ عثمانی اور ان کے رفقاء نے چونکہ مذکورہ بالا نعرہ کو عملی جامہ

پہنانے کے لیے اپنی مقدس زندگیاں وقف کر رکھی تھیں - اس لیے وہ ہر اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار و بیقرار تھے، جو قائم ہونے والے پاکستان کے آئین کی بنیاد قرآن و سنت کو تسلیم کرانے کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ مذکورہ بالا چٹھی موصول ہونے پر علامہ شبیر احمد عثمانی نے نہ صرف اس جماعت کی رکنیت، بلکہ قیادت بھی منظور فرماتے ہوئے حسب ذیل تاریخی جواب لکھا :-

"اکابر مسلم لیگ کے وہ اعلانات جو گذشتہ الیکشن کے دوران میں پاکستان میں اسلامی اور قرآنی نظام قائم کرانے کے متعلق کیے گئے تھے۔ میں اپنی خاص و عام مجالس اور تحریر و تقریر میں برابر دہراتا رہا ہوں - ۹ رجون ۱۹۴۷ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے موقعہ پر ایک وفد کی معیت میں میری جو گفتگو اس سیاق میں جناح صاحب سے ہوئی - اس میں موصوف نے ہم کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے قیام کے بعد کوئی کمیٹی علماء کی بنائی جائے گی جو مجوزہ دستور کی شرعی نقطہ نظر سے جانچ کرے گی۔

میں اس نظریہ (آئین اسلامی) کا دل سے حامی ہوں اور جس حد تک موقعہ ملے، اپنی بساط کے موافق اس بارے میں سعی کرنا اپنا فرض مذہبی سمجھتا ہوں چونکہ میرا انتخاب دستور ساز اسمبلی کے لیے بھی ہو چکا ہے۔ میرا عزم مصمم ہے کہ وہاں پہنچ کر اپنی استطاعت کی حد تک اس سلسلہ میں پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کروں، خواہ کوئی میری پارٹی کا ساتھ دے یا نہ دے اور آخری نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ نہ صرف میرے ضمیر کی آواز ہو گی، بلکہ مجھے یقین ہے کہ میں اس طرح کروڑوں مسلمانوں کے صحیح جذبات

اور ان کے ایمانی تقاضوں کی سچی ترجمانی کروں گا۔ اس لیے لاہور میں جو بعض علماء نے "آئین ساز مجلس العلماء" کے نام سے ایک جماعت قائم کی ہے، اس کی شرکت میں نے منظور کر لی ہے اور ان سے کہہ دیا ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی دعوتِ تعاون کا دائرہ تنگ نہ کریں، بلکہ ہر قسم کے علماء اور دانشمند ماہرین کو جو اس کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس میں مدد کر سکتے ہوں، دعوت دیں۔ خواہ ان کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو، شرط صرف اتنی ہے کہ اسلام کے اوّلین اساسی اصول میں ان کو کوئی اختلاف نہ ہو، یقین جانتا ہوں کہ باوجود ہمارے ہزاروں اختلافات کے اس نقطۂ مرکزی پر ہم سب مجتمع ہو سکتے ہیں کہ نوعِ انسانی کے دنیوی اور اخروی مصائب کا واحد علاج اس نظامِ حکومت کے قیام سے متصور ہے جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے فطری اصول اور تاریخِ عالم کے درخشاں ترین عہدِ حکومت کی بہترین روایات پر قائم ہو، مذکورہ بالا جماعت جو لاہور میں قائم ہوئی ہے، اس کا منشاء وہی ہے کہ بحث و تمحیص کے بعد سرِدست چند جامع اور بنیادی اصول و حقائق ایسے چن لیے جائیں، جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے اچھے اسلوب کے ساتھ پیش کیے جا سکیں"۔

(حیات شیخ الاسلام ص۴۹ تا ص۵۱)

گورنر جنرل سے ملاقات

مارچ ۱۹۴۸ء میں جب قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل مشرقی پاکستان کے دورہ پر تشریف لے گئے تو مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو وہاں تمام جلسوں میں شرکت کرنی پڑی، جن میں قائدِ اعظم

نے خطاب کرتا تھا۔ چونکہ مولانا عثمانی کو عام جلسوں میں قائد اعظم کے پاس ہی جگہ دی گئی۔ اس لیے انہیں تین مرتبہ ایسے موقعوں پر قائد اعظم سے سرسری گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ مگر مفصل گفتگو دو مرتبہ کی خصوصی ملاقاتوں میں ہوئی۔

ایک دن مولانا ظفر احمد عثمانی دستور سازی کے مسئلہ پر قائد اعظم سے گفتگو کرنے کے لیے ذاتی طور پر ان کی ڈھاکہ کی قیامگاہ پر پہنچے۔ گورنر جنرل پاکستان نے حسب دستور سابق کھڑے ہو کر ان سے سلام و مصافحہ کیا اور مزاج پرسی کے بعد دریافت کیا کہ :-

فرمایئے! آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں؟

اس وقت صرف قائد اعظم، مولانا عثمانی اور مولانا کے سیکرٹری مولانا دین محمد صاحب موجود تھے۔ خواجہ ناظم الدین (جو بعد میں وزیر اعظم پاکستان بنے) باہر برآمدہ میں ٹہل رہے تھے۔ قائد اعظم کا کوئی مترجم موجود نہ تھا۔ کیونکہ قائد اعظم اب اچھی طرح اردو بول سکتے تھے۔

مولانا عثمانی کا شکوہ

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی روئیدادِ ملاقات میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے کہا کہ مجھے سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ پاکستان اس لیے نہیں لیا تھا کہ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان قتل اور لاکھوں مسلمان خاندان برباد ہو جائیں ہم نے اس خطرہ کو دہلی میں پہلے ہی آپ پر ظاہر کیا تھا، مگر آپ نے ہم کو یقین دلایا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ مگر جو خطرہ ہم نے ظاہر کیا تھا، وہ پیش آکر رہا۔ پھر یہ سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ آپ نے اس کا کیا انتظام فرمایا؟ پھر اگر پاکستان میں نظامِ اسلام جاری ہو گیا ہوتا، تو ہماری اشک شوئی ہو جاتی اور ہم سمجھتے کہ ان قربانیوں کی تلافی نظامِ اسلام جاری ہونے سے ہو گئی۔ جو بہت بڑی نعمت

ہے - افسوس وہ بھی اب تک نہ ہوا تو ہم قوم کو کیا منہ دکھلائیں کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا، وہ بھی حاصل نہ ہوا اور نقصان حد سے زیادہ ہو گیا -

قائد اعظم کا جواب

قائد اعظم نے فرمایا کہ جو کچھ آپ کو کہنا تھا وہ فرما چکے یا کچھ اور بھی کہنا ہے ؟ میں نے کہا کہ مجھے اتنا ہی عرض کرنا تھا - ہماری ملاقات کیلئے صرف دس منٹ کا وقت دیا گیا تھا - مگر یہ واقعہ ہے کہ قائد اعظم نے ہمارے ساتھ کبھی یہ معاملہ نہیں کیا کہ وقت ختم ہو جانے پر کھڑے ہو جائیں - چنانچہ اب بھی ایسا ہی ہوا -

قائد اعظم نے میرے دونوں سوالوں کا جواب آدھ گھنٹہ میں دیا - پہلے سوال کے جواب میں فرمایا کہ مولانا جو خطرہ آپ کو تھا، اس کا احساس مجھے بھی تھا مگر میرا یہ خیال تھا کہ پاکستان بننے پر ہندو کچھ ایسی ہی شورش کریں گے، جیسی قربانی یا محرّم کے موقعہ پر کبھی کبھی کیا کرتے ہیں - سو میری قوم نے ایسے موقعہ پر کبھی ہندو سے شکست نہیں کھائی ہمیشہ غالب ہی رہی ہے - ایسا اس دفعہ بھی ہوگا اس کا مجھے وہم بھی نہ تھا کہ اس قوم کو بالکل کاٹا جائے گا اور یہ انسانیت سے نکل کر بربریت پر اتر آئے گی کہ عوام فسادیوں کے ساتھ فوج اور پولیس اور سول حکام بھی مسلمانوں کو کچلنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ نالائق لارڈ مونٹ بیٹن انگریز ہو کر برطانیہ کی روایات کو ایسا پس پشت ڈال دے گا کہ اس خونیں ڈرامہ کا تماشہ دیکھتا رہے گا اور ذرا بھی اس کے دل میں انصاف کا جذبہ پیدا نہ ہوگا - اس وقت میرے پاس دو صورتوں

کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ ایک یہ کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے بھارت پر حملہ کر دیتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے حصّہ کی فوج ابھی تک پاکستان نہ پہنچی تھی۔ وہ ہندوستان سے باہر دور دراز مقامات پر تھی اور ہمارے حصّہ کا اسلحہ بھی ہندوستان کے قبضہ میں تھا۔

میں نے کہا وہ تو اب تک بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ ہم کو یہی تو خطرہ تھا کہ اڑھائی مہینہ میں پاکستان لینے کا یہی نتیجہ ہوگا کہ صرف پروانہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ نہ فوج ہوگی نہ اسلحہ!

قائداعظم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ دوسری صورت یہ تھی کہ میں دُنیا سے احتجاج کرتا۔ یہ البتہ میں نے کیا اور میرے احتجاج پر دنیا کی طرف سے مبصرین آئے اور انہوں نے ہندوستانی حکومت کو نااہل اور لارڈ مونٹ بیٹن کو مورد الزام قرار دیا۔ اس کے بعد یہ طوفان ٹھنڈا ہوا۔ پھر قدرت نے ہندوؤں کے ان مظالم کا انتقام دوسری طرف سے لے لیا (جنگ کشمیر کی طرف اشارہ تھا جو اس وقت ہو رہی تھی) وہاں ان پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ مدتوں یاد رکھیں گے۔ ان کا مالی اور جانی بہت نقصان ہو چکا ہے اور دیکھئے کب تک ہوگا۔

قائداعظم نے مزید فرمایا کہ ہندوؤں کی سکیم یہ تھی کہ پاکستان نوزائیدہ حکومت ہے۔ اس کی طرف مسلمانوں کی کثیر تعداد کو دھکیل دیا جائے تاکہ وہ اس کی آبادکاری میں اس قدر اُلجھ جائے کہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے۔ مگر خدا کا فضل و کرم ہے کہ پاکستان ان مصائب سے گذرتا ہوا مضبوط و مستحکم ہی بنتا چلا گیا! اب

وہ سمجھ گئے ہیں کہ پاکستان مضبوط سلطنت ہے جس کو ہضم کرنا آسان نہیں باقی رہا نظام اسلام کا مسئلہ تو آپ مطمئن رہیں۔ ذرا مجھے مہاجرین کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور اسمبلی کو بھی اطمینان نصیب ہو جائے، تو انشاء اللہ بہت جلد دستور پاکستان اصول اسلام کے موافق مرتب ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں ایک لارڈ بشپ ہوگا۔ اس کا ترجمہ آپ کیا کریں گے؟ میں نے کہا "شیخ الاسلام" کہنے لگے ہاں! ایک شیخ الاسلام ہوگا۔ جو حکومتِ پاکستان کو کنٹرول کرتا رہے گا کہ کوئی دستور اور کوئی قانون خلافِ اسلام پاس نہ ہو سکے۔"

قائد اعظم سے دوسری ملاقات

قائد اعظم جب چاٹگام کا دورہ کرنے کے بعد واپس ڈھاکہ تشریف لائے، تو جمیعۃ علمائے اسلام کے وفد نے قائد اعظم سے ملاقات کی۔ جس کے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی امیر الوفد تھے۔ مولانا نے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے قائد اعظم سے فرمایا۔ جیسا کہ ان کی روئیداد میں درج ہے کہ:۔

"آپ نے حصولِ پاکستان سے پہلے وعدہ فرمایا تھا کہ دستورِ پاکستان کتاب و سنت کے موافق ہوگا۔ یہ وعدہ جلد پورا کیا جائے۔ کیونکہ ہم نے قوم سے یہی وعدہ کیا تھا اور اب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ وہ اسلامی نظامِ حیات کہاں ہے؟" قائد اعظم نے اس وقت بھی ہم سب کو اطمینان دلایا کہ "یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ میں نے قوم سے کبھی دھوکا نہیں کیا۔ آپ کی حکومت اسلامی حکومت ہے اس کا دستور اسلام کے اصول پر نہ ہوگا تو اور کس اصول پر ہوگا؟ اور

یہ انشاء اللہ جلد مکمل ہو کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اسمبلی کے اندر موجود ہیں۔ ان کی رہنمائی میں کام ہو رہا ہے۔ چند ناگہانی مصائب کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ اب زیادہ دیر نہ ہو گی"۔

ناگہانی مصائب

یہ ناگہانی مصائب مندرجہ ذیل تھے :۔

الف : ہندوؤں نے عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کو حوالہ شمشیر و آتش کرنے کے پروگرام کو نیز سے تیز تر کر دیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں لاکھوں مہاجرین کا سیلاب آگیا۔ ابھی اربابِ حکومت خود سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ انہیں اپنے ان ستم رسیدہ بھائیوں کو سنبھالنا پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کی معیشت پر ناقابلِ برداشت بوجھ آن پڑا اور جس سے حکومت کو عہدہ برآ ہونا تھا۔

ب۔ کشمیر پر جو پاکستان کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، ہندوستان نے قبضہ کرنے کے لیے ایسے وقت میں فوج کشی کر دی جب کہ حکومتِ پاکستان کا تمام اسلحہ ہندوستان کے قبضہ میں تھا اور وہ بالکل بے سروسامانی کے عالم میں تھی۔ مگر بایں ہمہ حکومت کو اپنے کشمیری بھائیوں اور مجاہدوں کی حفاظت و مدافعت کی طرف بھی فوری طور پر متوجہ ہونا پڑا۔

ج۔ تیسری مصیبت جناب مودودی صاحب کی پیدا کردہ تھی جنہوں نے ۱۹۴۸ء میں یکے بعد دیگرے ایسے فتوے صادر کیے جن سے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچتا تھا مثلاً :۔ ۱۔ اربابِ اقتدار کے خلاف یہ پروپاگنڈا کیا گیا کہ :۔

"ہمارے اربابِ اقتدار میں سے ننانوے فیصدی بددیانت اور ناقابلِ اعتماد نکلے ہیں"۔ (کوثر۔ یکم اپریل ۱۹۴۸ء)

۲۔ عوام کو یہ کہہ کر بہکایا گیا کہ تم نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی خاطر پاکستان کو ووٹ

دیتے تھے - مگر اربابِ اختیار سابقہ کافرانہ نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور رکھنا چاہتے ہیں - لہٰذا :-

"ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لو۔" (خطبات ص ۲۲۶)

۳- ملازمین سرکار کو یہ ترغیب دی گئی کہ مملکت سے وفاداری کا حلف اٹھانا غیر اسلامی کارروائی ہے - جیسے مودودی صاحب اپنے اس بیان میں جو انہوں نے میاں انور علی صاحب انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کے روبرو تحقیقاتی عدالت کی تردید میں جاری کیا تھا اور جو ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کے "نوائے وقت" میں شائع ہوا تھا، ان الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ میں نے ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء میں بعض ملازمین سرکار کے استفسار پر یہ جواب لکھا تھا کہ :-

"۱۹۳۵ء کے عارضی دستور کا جس کو پچھلی غیر اسلامی حکومت ہمارے لیے ورثہ کے طور پر چھوڑ گئی ہے اور جن کو ایک مستقل دستور سے بدلنے کے لیے ہماری دستور ساز اسمبلی کام کر رہی ہے، حلف لینا اس مرحلے پر مناسب نہیں۔"

۴- اور اسی بیان میں وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں ملک کی دفاع کی سکیم نیشنل گارڈ میں بھرتی ہونے والے نوجوانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ نیشنل گارڈ میں :

"ہم اس وقت تک شامل نہیں ہو سکتے، جب تک اسلامی دستور کا اصول طے نہ ہو جائے۔"

۵- مئی ۱۹۴۷ء کے دوسرے ہفتہ میں جناب نبی بخش صاحب انچارج شعبہ نشر و اشاعت آزاد کشمیر گورنمنٹ نے جماعت اسلامی کے اجتماع پشاور کے موقع پر مودودی

صاحب سے سوال کیا کہ آپ جہاد کشمیر میں کیوں حصہ نہیں لیتے ، تو انہوں نے فرمایا کہ " میں شرعاً اسے جائز ہی قرار نہیں دیتا " جس پر سارے پاکستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ، تو انہوں نے اپنے اس فتویٰ پر اصرار کرتے ہوئے ایک لمبا چوڑا بیان دیا ۔ جس میں صاف صاف فرمایا کہ :-

" جب تک حکومت پاکستان نے حکومت ہند کے ساتھ معاہدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں ۔ پاکستانیوں کے لیے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنا از روئے قرآن جائز نہیں ہے " ۔ (تسنیم ۱۲ / اگست ۱۹۴۸ء)

پاکستان دشمنی

مودودی صاحب نے جو ابتداء ہی سے نظریہ پاکستان کے مخالف تھے اور جنہوں نے اس مخالفت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تھی ، اس لیڈر کی حیثیت سے ، جو صرف موزوں حالات سے ہی فائدہ اٹھانے کا عادی ہوتا ہے ۔ جب اس نوزائیدہ حکومت پاکستان کو جس نے ابھی اپنی عمر عزیز کے نو ماہ بھی پورے نہیں کیے تھے ۔ دشمنانِ پاکستان کے جارحانہ حملوں میں گھرا ہوا پایا تو انہوں نے بھی مندرجہ ذیل پانچ طریقوں سے حکومتِ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی ۔ جس پر کشمیر جموں ریڈیو اور ہندوستان کا پریس مودودی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگا اور ان کی " بالغ نظری " کی تعریف کرنے لگا ۔

یہی حالات جب ملک کی سب سے بڑی تحقیقاتی عدالت کے سامنے آئے تو اس کے فاضل ججان عالی مرتبت چیف جسٹس میاں محمد منیر صاحب اور جسٹس مسٹر ایم ۔ آر کیانی صاحب نے اپنی تاریخی رپورٹ میں جماعت اسلامی کے متعلق لکھا کہ :-

الف " ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ' ان میں سے ایک

بھی ایسی نہیں جس میں مطالبۂ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں، تمام کی تمام اس تشکل کی مخالف ہیں۔ جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔" (صـ ۲۶۱)

ب۔ "موجودہ حالات میں ہمارے تمام معاملات غیر حل شدہ حالت میں ہیں اس حالت میں حکومت کے سینہ پر پستول رکھ کر اسے کسی مطالبہ کو پورا کرنے یا کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔ نہ صرف غیر آئینی بلکہ صاف طور پر وطن دشمنی کا فعل ہے اور یہ طریقہ صرف وہی جماعت اختیار کر سکتی ہے، جو حکومت کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی خواہاں ہو۔" (صـ ۲۶۲)

ج۔ "ایک فوجی عدالت میں اس جماعت کے بانی نے یہ بیان کیا کہ مسلح بغاوت کے سوا جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت کو توڑ کر جماعتِ اسلامی کے تصور کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔" (صـ ۲۶۱)

فراستِ اشرف

جناب مودودی صاحب یا ان کی جماعت نے جو حالات ۱۹۴۸ء میں پیدا کیے انہیں مفکرِ پاکستان حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تقریباً چھ سال پہلے اپنی چشمِ فراست سے دیکھ رہے تھے۔ جس کی بناء پر انہوں نے جماعتِ اسلامی کے سرگرم رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ کو ان کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا کہ:۔

"اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر وارد نہ کیا جا سکے، لیکن میرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔" (خاتمۃ السوانح صـ ۲۴)

آخر پاکستان چاہنے والا وہ مردِ درویش یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی سالمیت کو نقصان پہنچائے۔ یہ حضرت تھانوی کا آخری زمانہ اور جماعت اسلامی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اور ابھی جماعت اسلامی کے وہ شاہکار منظرِ عام پر نہیں آئے تھے، جو دینی یا سیاسی نقطۂ نظر سے محلِ نظر تھے۔ اسی لیے حضرت تھانوی نے اپنی تحریر میں احتیاط کے طور پر "اگرچہ" اور "بظاہر" کے الفاظ استعمال کیے، جو اس بات کی دلیل تھے کہ حضرت تھانوی کو فراستؒ اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ یہ لوگ دینداری کے ادعا کے باوجود دنیاداروں کے طور و طریقہ پر چل کر ہوسِ اقتدار کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ مولانا محمد منظور صاحب جو بصد شوق خدمتِ دین کے لیے اس جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں دین کی بجائے سیاست کی راہ پر گامزن دیکھ کر ان سے علیحدہ ہو گئے اور تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر خدمتِ دین میں مصروف ہو گئے۔

دستورِ پاکستان کا خاکہ

پاکستان بنے ہوئے ابھی چھ سات ماہ ہی گزرے تھے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی کہ جس غرض کے لیے پاکستان بنایا گیا اور جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں کی قربانی اور خاندانوں کی بربادی برداشت کی گئی۔ اب اس کا دستور، اسلام کے اصولِ صحیحہ پر ایسا مرتب ہو جس کے تحت اسلامی نظام کی برکات کا مشاہدہ کر سکیں اور اسے دوسروں کے لیے نشانِ راہ کے طور پر پیش کر سکیں۔

چنانچہ کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے مشورہ سے کچھ مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے اصول پر بنانے کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا جائے، جو ممبرانِ اسمبلی کے سامنے رکھا جا سکے اور اس کی روشنی میں دستور بنوانے

کی سعی کی جا سکے۔ حضرت ممدوح نے مشورہ سے مندرجہ ذیل چار علماء اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

۲۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔

۳۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔

۴۔ مولانا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدر آبادی۔

مگر حسنِ اتفاق ایسا ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی اس وقت پاکستان میں موجود نہ تھا۔ سب کے سب ہندوستان میں مقیم تھے۔ حالانکہ ان میں سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی زندگی سخت خطرہ میں تھی۔ کیونکہ ہندو انہیں دشمن نمبرا تصوّر کرتے تھے۔ کہ انہوں نے علامہ عثمانی کے ساتھ مل کر جہاد پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مگر با ایں ہمہ انہوں نے پاکستان آنے کی ابھی تک کوئی سعی نہ کی تھی۔

ان حضرات کو پاکستان لانے کے لیے مذکورہ بالا جماعت نے ایک آدمی ہندوستان بھیجا، جس نے انہیں تدوینِ دستور کے لیے کراچی آنے کی دعوت دی۔ مولانا سید سلیمان ندوی تو کسی عذر کے سبب اس وقت نہ آسکے۔ باقی تینوں حضرات کام کی اہمیت کے پیشِ نظر فوراً پاکستان آگئے اور وسط ۱۹۴۸ء میں یہ حضرات دستوری خاکہ مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے اور تقریباً تین ماہ میں ایک مختصر سا خاکہ علامہ عثمانی کی زیرِ ہدایت مرتب کر لیا۔ باقی حضرات تو واپس چلے گئے، مگر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو دو وجوہات کی بناء پر کراچی روک لیا گیا۔ ایک تو اس لیے کہ ان کا بھارت واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ دوسرے اس لیے کہ اس کام کی تکمیل کے لیے ان کا یہاں رہنا اشد ضروری تھا۔

قائدِ اعظم کی رحلت

عوام، علماء اور ارکانِ دستوریہ کے درمیان اسلامی آئین کے ضامن صرف قائدِ اعظم ہی تھے۔ انہوں نے اگرچہ اپنی ایک ملاقات میں علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع سے فرمایا تھا کہ :-

"میں پاکستان کے مقدمہ میں مسلمانوں کا وکیل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقدمہ میں کامیاب کیا۔ پاکستان ان کو مل گیا۔ اب میرا کام ختم ہوا۔ اب مسلمانوں کی اکثریت و جمہوریت کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہے نظام قائم کرے اور چونکہ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے، تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں نظامِ اسلامی اور اسلامی ریاست قائم ہو"۔

مگر اخلاقی طور پر وہ اپنے ان وعدوں کے بھی پابند تھے جو انہوں نے علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء کار سے کر رکھے تھے۔ اس لیے علماء کرام اور عوام کی امیدیں زیادہ تر قائدِ اعظم کی ذات سے وابستہ تھیں، نہ کہ ارکانِ دستوریہ سے۔

مگر قدرت کو ملّتِ اسلامیہ کا ابھی ایک اور امتحان منظور تھا۔ اس لیے اس نے قائدِ اعظم کو فانی دُنیا سے ابدی دُنیا میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کے آثار دیکھ کر قائدِ اعظم کے معالج ڈاکٹروں نے گھبرا کر قائدِ اعظم سے کہا کہ اب پاکستان کو ساحلِ مراد پر کون پہنچائے گا۔ اس ایک فقرہ نے قائدِ اعظم کی آنکھوں کے سامنے اس محسن ناشناس قوم کے کردار کی ایک فلم چلا دی جب انہیں ساری قوم میں کوئی شخص بھی ایسا نظر نہ آیا جو اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا تو اس صدمہ سے ایک موٹا سا چمکدار آنسو ان کی مسہری پر گر پڑا اور انہوں نے آہستہ سے یہ فرماتے ہوئے کمبل سے منہ ڈھانپ لیا کہ :-

"اے خدا! تو نے مسلمانوں کو آزادی عطا کی ہے۔ اب تو ہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ میری قوم ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے، کمزور ہے، ابھی اس کی صفوں کا کج بھی دُور نہیں ہوا۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے اور تو ہی اس کا حامی و ناصر ہے"۔ (آخری لمحات)

اور اس طرح وہ پاکستان کو خدا کے حوالے کرتے ہوئے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اپنی آخری آرامگاہ کو سدھار گئے۔ ان کے انتقال سے علامہ شبیر احمد عثمانی کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی اور دستورِ اسلامی کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

مودودی صاحب کی گرفتاری

ملتِ اسلامیہ تو قائدِ اعظم کا سوگ منا رہی تھی اور جماعت اسلامی دستورِ پاکستان کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ جس کی تفصیل پیچھے پیش کی جا چکی ہے۔ اس لیے حکومتِ پاکستان نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مودودی صاحب اور ان کے دستِ راست محمد طفیل صاحب کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے ماتحت گرفتار کر لیا اور اس سے اگلے روز محمد امین احسن صاحب اصلاحی کو بھی گرفتار کر کے ان کے ساتھ نظر بند کر دیا۔

جماعتِ اسلامی نے اگرچہ دینی لبادہ اوڑھ رکھا ہے، مگر دراصل وہ بالکل سیاسی جماعت ہے۔ جس کا اس کے جماعتی مجلہ "ترجمان القرآن" میں یوں اعتراف کیا گیا ہے۔

"اس (جماعت اسلامی) کا دین ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سیاست ہے اور کہیں بھی سیاست سے الگ نہیں"۔

(ترجمان القرآن صفحہ ۱۶ ماہ اپریل ۱۹۵۰ء)

اس جماعت کے دینی ادعا کی وجہ سے بہت سے سرکاری ملازمین بھی اس کے ممبر تھے اور وہ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا فتووں سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہی فتووں کی بنا پر

الف: حلف وفاداری اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور

ب: سول سیکرٹریٹ میں گڑبڑ پیدا کر دی تھی۔

جس کی وجہ سے حکومتِ پاکستان نے ایک گشتی چھٹی جاری کر کے ملازمین سرکار کے لیے اس جماعت اسلامی کے ممبر ہونے کی ممانعت کر دی تاکہ اس کی ریشہ دوانیوں سے آئندہ انتظامی مشینری میں کسی قسم کا تعطل پیدا نہ ہو۔

ناجائز فائدہ سیاست دان ہمیشہ حالاتِ زمانہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی نظر بندی اور ان کی جماعت کی رکنیت پر پابندی سے جماعتِ اسلامی کو حکومتِ پاکستان کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کے لیے ایک اور حربہ ہاتھ آ گیا اور اس نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے، ملک کے طول و عرض میں اس پروپاگنڈا کو تیز سے تیز تر کر دیا کہ "لا الٰہ الا اللہ" کی اساس پر بننے والے پاکستان کے اربابِ اقتدار، پاکستان کا آئین کتاب و سنت کے مطابق نہیں بنانا چاہتے اور اسی لیے وہ اسلامی آئین کا مطالبہ کرنے والوں کو قید و بند کر رہے ہیں"۔ حالانکہ اربابِ حکومت نے جائز اور دیانتدارانہ طریق سے ایسا مطالبہ کرنے والے علماء اسلام سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔

ردِ عمل جماعتِ اسلامی کے اس سیاسیانہ، مخالفانہ، معاندانہ اور خود غرضانہ پروپاگنڈا نے حالات کو زیادہ نازک بنا دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے اربابِ اختیار و

اقتدار اور ارکانِ دستور یہ کی اکثریت انگریزی ماحول کی تربیت یافتہ تھی۔ دستورِ اسلامی سے کماحقہٗ ناواقف تھی اور ایسے لوگوں کے زیر اثر تھی، جو پاکستان میں دستورِ اسلامی کے نفاذ کے مخالف تھے۔ اِس لیے انھوں نے جماعت اسلامی کے مذکورہ بالا پروپاگنڈا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اربابِ اختیار و اقتدار کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کر دیا کہ "یہ اسلامی آئین کا شور مچانے والے دراصل اس آڑ میں آپ سے عنانِ اقتدار چھیننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں مغربی ممالک کی طرح ایک سیکولر یعنی لادینی نظامِ حکومت قائم کر دیا جائے تاکہ سرے سے یہ خطرہ ہی باقی نہ رہے۔" جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضد اور خود غرضی کے جذبہ کے ماتحت اربابِ اقتدار نے قائدِ اعظم کے اس فرمان کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا کہ:۔

> "اپنے لیے ایک مملکت قائم کرنا ہی ہمارا نصب العین نہیں تھا، بلکہ یہ ذریعہ تھا۔ نصب العین کے حصول کا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں، جہاں ہم اپنی اسلامی روایات اور تمدنی خصوصیات کے ساتھ ترقی کر سکیں۔" (بیان مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اور پاکستان میں ایک لادینی نظام رائج کرنے کے لیے خفیہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور عوام میں جماعتِ علمائے کرام کے خلاف بلطائف الحیل نفرت پھیلانی شروع کر دی جو اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے میں پیش پیش تھی۔

استعفیٰ پر آمادگی

علامہ شبیر احمد عثمانی اور اُن کے رفقائے کار، جنھوں نے:۔

"ہندو اور انگریزوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسلام کو سربلند دیکھنے کی آرزو میں عزیز و اقارب کو چھوڑا، گھر چھوڑا، گھر کا آرام چھوڑا، مال و متاع، اراضی، باغات کو خیرباد کہا۔ کفن سر سے باندھ کر پاکستان

کی حمایت میں صدائے حق بلند کی۔ اپنوں کی مخالفت، غیروں کی دشمنی مول
لی، قتل کی دھمکیاں سہیں۔" (حیات شیخ الاسلام ص۱۶)

وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان طلب کیا گیا تھا۔
اس مقصد کو ذاتی اغراض و اقتدار کی نذر کر دیا جائے۔ اس لیے علامہ شبیر احمد عثمانی نے، جو
اس عزم صمیم کے ساتھ دستور ساز اسمبلی میں داخل ہوئے تھے کہ "وہاں اپنی استطاعت
کی حد تک اسلامی دستور کے لیے پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کریں گے۔ خواہ کوئی
ان کی پارٹی کا ساتھ دے یا نہ دے اور خواہ آخری نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔" ارباب
اقتدار کے خفیہ منصوبوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مجلس دستور ساز
سے استعفیٰ دینے پر تیار ہو گئے اور استعفیٰ لکھ کر اپنے رفقاء کے حوالے کر دیا۔ مگر بعض
مخلصین نے علامہ موصوف کو استعفیٰ دینے سے بدیں وجہ روک دیا کہ "آپ مجلس
دستور ساز کے اندر رہ کر صدائے احتجاج بلند کریں اور ارباب اقتدار کے عزائم کو بے
نقاب کریں۔ آپ کے مستعفی ہو جانے سے تو انہیں کھلی چھٹی مل جائے گی اور یہی وہ چاہتے
ہیں کہ کسی طرح راستہ کے یہ کانٹے ہٹا دیئے جائیں۔"

علامہ عثمانی کا چیلنج

ارباب اقتدار کے خود غرضانہ طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے ۹ - ۱۰ فروری ۱۹۴۹ء کو ڈھاکہ میں جمیعۃ علماء اسلام کی ایک کانفرنس زیرِ صدارت علامہ شبیر احمد عثمانی منعقد ہوئی۔
اور علامہ موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارباب اقتدار کے طرزِ عمل پر سے یوں پردہ
اٹھایا:۔

"حصولِ پاکستان کے بعد علماء و مشائخ کی ان مساعی عظیمہ کو ارباب اقتدار

نے قطعاً فراموش کر دیا ہے۔ مذہبی طبقہ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تو درکنار، نشر و اشاعت کے اُن تمام ذرائع سے جو حکومت کے دامن سے وابستہ ہیں، اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مذہبی عنصر زیادہ چمکنے یا ابھرنے نہ پائے اور جہاں تک ہو سکے۔ اس کو خمول اور کس مپرسی کی حالت میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ وقت پڑنے پر علماء کو احمق بنا لیا جاتا ہے۔ جب کام نکل گیا تو اُن سے کوئی تعلق نہیں۔"

ارباب حکومت کے رویہ سے عوام کو آگاہ کرنے کے بعد علامہ عثمانی نے پوری ذمہ داری سے ارباب اختیار کو چیلنج کیا کہ:۔

"میں بالکل صفائی سے بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ صورتِ حال ہمارے لیے کوئی غیر متوقع چیز نہیں۔ ہم یقیناً پہلے سے جانتے تھے کہ ایسا ہو گا اور پاکستان کی زمام اقتدار کا بحالات موجودہ جن ہاتھوں میں پہنچنا ناگزیر تھا، اُن سے اس کے سوا کوئی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم ان کی نسبت بحمد اللہ کسی فریب میں مبتلا نہ تھے۔ ہم نے یہ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے جداگانہ قومیت اور اصول پاکستان کی مخلصانہ حمایت مذہبی نقطہ نظر سے حق اور صحیح سمجھ[1] کر کی اور آئندہ بھی انشاء اللہ اس کی حفاظت کے معاملہ میں رجال حکومت کی کوئی ناپسندیدہ روش ہماری جد و جہد پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ خواہ

---

[1] اور اگر اسے احمق بنا کہتے ہیں تو ہم جان بوجھ کر احمق بنے ہیں۔ کما قال ابن عمر من خدعنا فی اللہ انخدعنا لہ۔

ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں۔ ہم خالص خدا کی خوشنودی اور اسلام اور اہلِ اسلام کی برتری اور بہتری کے لیے اپنی اس نئی مملکت کو مضبوط اور محفوظ بنانے میں امکانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ ساتھ ہی ہم اس کوشش سے بھی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے کہ مملکتِ پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظامِ حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رو سے اس بات کا مؤثر انتظام کیا جائے کہ مسلم قوم اپنی زندگی اسلام کے انفرادی و اجتماعی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق، جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں، مرتب و منظم کر سکے اور کوئی ایسا قانون، بل اور آرڈی نینس جاری یا نافذ نہ ہو سکے، جو احکامِ اسلام کے خلاف ہو۔"

چیلنج کا نتیجہ علامہ عثمانی کے اس چیلنج سے ایوانِ اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ اس وقت نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم تھے۔ علامہ عثمانی کو جمہورِ مسلمین میں جو مرکزیت اور مرجعیت حاصل تھی اس سے بخوبی واقف تھے اور الیکشن و ریفرنڈم کے زمانہ میں وہ اس کا بچشم خود مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے خدامِ دربارِ اشرفیہ اور علماء، اسلام اور عوام کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر آئین سازی کی مہم کو تیز تر کر دیا۔ ان کی درخواست پر علامہ عثمانی نے قراردادِ مقاصد کا مسودہ تیار کیا، جو جامع ہونے کی وجہ سے چند سطروں پر مشتمل تھا۔ مگر اربابِ اقتدار اور اربابِ اغراض کی جرح و قدح کی وجہ سے انہوں نے ان کی تسلی کی خاطر ان کی ترمیمات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ شاملِ مسودہ کر لیا کہ اس کا مفہوم و مطلب اور اس کی روح بالکل برقرار رہی۔

قرار داد مقاصد

چنانچہ مجلس دستور ساز نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو مندرجہ ذیل قرار دادِ مقاصد منظور کر لی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی مصالحت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے، لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلسِ دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیاراتِ حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے۔

جس میں اصولِ جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں،

اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاقیہ بنائیں۔ جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت خودمختار ہوں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق کے ماتحت مساواتِ حیثیت و مواقع قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی و سیاسی عدل، اظہارِ خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رو سے نظامِ عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا، جن میں اس کے بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں اور اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کماحقہٗ اضافہ کر سکیں"۔

خراجِ تحسین

قرارداد مقاصد کی منظوری علامہ عثمانی کا وہ دوسرا تاریخی کارنامہ تھا۔ جو تاریخِ پاکستان میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔ اس کی منظوری کے موقع پر علامہ عثمانی نے ایک معرکتہ الآرا تقریر ارشاد فرمائی۔ جس پر انہوں

نے نہ صرف پاکستان سے بلکہ تمام عالمِ اسلام سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ چونکہ قرارداد مقاصد قائدِ ملّت نوابزادہ لیاقت علی خاں کی مخلصانہ مساعی سے ہی منظور ہوئی تھی، اس لیے علامہ عثمانی نے اُن کی ان تاریخی مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے اور ان کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"یاد رکھیئے ! دنیا اپنے خود ساختہ اصولوں کے جس جال میں پھنس چکی ہے۔ اس سے نکلنے کے لیے جس قدر پھڑپھڑائے گی، اسی قدر جال کے حلقوں کی گرفت اور سخت ہوتی چلی جاوے گی۔ اگر غور کیا جائے، تو یہ مبارک باد دراصل میری ذات کی طرف سے نہیں، بلکہ اس پسی ہوئی اور کچلی ہوئی رُوحِ انسانیت کی جانب سے ہے۔ جو خالص مادہ پرست طاقتوں کی حریفانہ حرص و آز اور رقیبانہ ہوس ناکیوں کے میدانِ کارزار میں مدتوں سے پڑی کراہ رہی ہے۔ اس کے کراہنے کی آوازیں اس قدر درد انگیز ہیں کہ بعض اوقات اس کے سنگ دل قاتل بھی انہیں سُن کر گھبرا اُٹھتے ہیں اور اپنی جارحانہ حرکات پر نادم ہو کر تھوڑی دیر کے لیے مداوا تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مگر علاج و دوا کی جستجو میں وہ اس لیے ناکام رہتے ہیں کہ مرض کے اصلی سبب ہی کو دوا اور اکسیر سمجھ لیا جاتا ہے"۔

(حیاتِ شیخ الاسلام صد ۵۲)

مقامِ حیرت

قرارداد مقاصد کی منظوری سے جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ آگیا، جس کے ذریعہ اس نے یہ پروپاگنڈا شروع کر دیا کہ یہ اس کے مسلک و مقاصد کے عین مطابق ہے اور اسی کی کوششوں

کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جس عرصہ میں قرارداد مقاصد کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی اور جس زمانہ میں [redacted] پاس ہوئی اس زمانہ میں جناب مودودی صاحب اپنے رفقاء سمیت نظر بند تھے۔ جماعت اسلامی اپنی مخالف پاکستان سرگرمیوں کی وجہ سے زیرِ عتاب تھی اور اسے ایوانِ حکومت کے قریب ہی نہ پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ جہاں قرارداد مقاصد کے لیے علماء اشرفیہ اور اربابِ اقتدار مصروفِ افہام و تفہیم تھے مگر جماعت اسلامی نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے قرارداد مقاصد کی منظوری کو اپنے "نامہ خدمات" میں اس لیے درج کر دیا کہ وہ اسے ہی زینہ بنا کر ایوانِ اقتدار میں پہنچنا چاہتی تھی۔ چنانچہ قرارداد مقاصد کو منظور ہوئے ابھی تین مہینے ہی گزرے تھے کہ وہ جون ۱۹۴۹ء کے اوائل میں، جماعت اسلامی کے اخبار تسنیم میں یہ آواز بلند کی گئی کہ ا۔

> "افسوس ہے کہ پاکستان میں بلکہ دنیائے اسلام میں اسلامی قانون کا سب سے بڑا ماہر، جس کا منصب یہ تھا کہ اسے پاکستان کا گورنر جنرل بنایا جائے آج آہنی سلاخوں میں ہے۔ میری مراد علامہ مودودی سے ہے"۔

گویا جماعتِ اسلامی نے جو محض نظریہ پاکستان کی مخالفت کے لیے وجود میں لائی گئی اور جس نے یہ پروپاگنڈا کر رکھا تھا کہ پاکستان ایک لادینی اسٹیٹ بنے گا۔ اس لیے نہ کوئی اس کی دفاعی افواج میں داخل ہو، نہ اس کی وفاداری کا حلف اٹھائے۔ قرارداد مقاصد کے پاس ہونے کے بعد خود کو پاکستان کا وارث ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

اُردو پر احسان

دستور ساز اسمبلی کی پہلے تمام کارروائی انگریزی میں ہوا کرتی جس سے علامہ شبیر احمد عثمانی ناواقف تھے۔ اس لیے انہیں اجلاس میں شرکت کرنے کے باوجود اجلاس کی کارروائی سے بے بہرہ رہنے سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ جس غرض کے لیے مجلس دستور ساز میں بھیجے گئے تھے، اس سے وہ غرض حاصل ہونی ناممکن تھی۔ اس لیے علامہ عثمانی نے اس دستور پر سخت احتجاج کیا کہ مجلس کی کارروائی انگریزی میں ہو اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ مجلس کی کارروائی دونوں زبانوں یعنی انگریزی و اردو میں ہوا کرے۔ تاکہ انگریزی نہ جاننے والے ممبران بھی صحیح معنوں میں مجلس کی کارروائی میں حصہ لے سکیں۔ چنانچہ مجلس دستور ساز نے آپ کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور اس کے بعد تمام کارروائی انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی ہونے اور چھپنے لگی۔

قتل کی دھمکیاں

علامہ شبیر احمد عثمانی جب سے جمیعۃ العلماء ہند سے علیحدہ ہو کر جمیعۃ علماء اسلام میں شامل ہوئے تھے، کانگریسی حلقے تب سے ہی اُن کے مخالف تھے۔ بلکہ وہ علامہ موصوف کی سرگرمیوں سے سخت بوکھلائے ہوئے تھے۔ جو مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق :-

"لیگ کی خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہ ملا اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ مرحوم نے کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا۔ مگر مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی"

(یادِ رفتگان صفحہ ۲۴۵)

[عو]ام اور حکومت کی نظروں میں علماء اشرفیہ و دیوبند کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے [ا]ن کے ازلی مخالفوں میں آتش حسد بھڑک رہی تھی اور وہ انہیں پاکستان کے خادموں [کی] صف اوّل میں کسی قیمت پر بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے - جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح [ح]ضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو مسلم لیگ کی حمایت کے جرم میں قتل کی دھمکیاں [د]ی گئی تھیں، اسی طرح علامہ عثمانی کو بھی پاکستان کی خدمت کے جرم میں خطوط [کے] ذریعہ قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں -

[خ]واہشِ شبّیر

مگر جو شخص خود سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلا ہو - وہ ان دھمکیوں کو کب خاطر میں لاسکتا تھا - چنانچہ آپ نے جمیعۃ علماء [اس]لام پنجاب کانفرنس منعقدہ لاہور میں اور دوسری مرتبہ شاہی مسجد لاہور میں تقریر کرتے [ہو]ئے ان تہدید آمیز خطوط کا ذکر فرماتے ہوئے عوام سے اپیل کی کہ :-

"بھائیو! اگر میں اسلام اور پاکستان کے راستے میں قتل کر دیا جاؤں، تو اللہ اور رسول کریمؐ کے نام پر میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری نعش کسی حالت میں بھی ہندوستان نہ بھیجنا بلکہ مجھے ہر حالت میں قلب پاکستان میں دفن کر دینا کیونکہ پاکستان کی سرزمین ہندوستان کے مقابلہ میں مقدس و مطہر ہوگی"

(حیات شیخ الاسلام ص۴۸)

[ع]لامہ عثمانی کی وفات

قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد اب بنیادی اصولوں پر غور کرنے کا کام جاری تھا - علامہ عثمانی [بنیا]دی اصولوں پر غور کرنے والی کمیٹی کے رکن اعلیٰ تھے کہ یکایک ان کی صحت جواب [د]ے گئی اور آپ نے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق تقریبات میں حصہ لینا بند کر دیا مگر

وزیر تعلیم ریاست بہاولپور کی درخواست خاص پر جامعہ عباسیہ کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم کرنے کے لیے آپ نے اس کا سرپرست بننا منظور کرلیا اور علم دین کی سربلندی کا جذبہ آپ کو کشاں کشاں ۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاولپور لے گیا۔ جو آپ کا آخری سفر دنیا تھا اور وہیں بحالت مسافرت ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو جان، جانِ آفرین کے سپرد کرکے شہادت کا درجہ پایا۔

آخری اعزاز

ریاست کے ولی عہد کرنل عباسی، وزیر اعظم کرنل ڈرگ، جنرل آفیسر کمانڈنگ، جنرل گریوز، ریاستی وزراء و حکام نے پورے اعزاز کے ساتھ آپ کی میت کو اسٹیشن پر پہنچایا۔ فوج نے مرحوم کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ جامعہ عباسیہ کے پرنسپل اور وزیر اعظم نعش لے کر کراچی روانہ ہوئے اور ڈیرہ نواب پہنچ کر انہوں نے شبیر پاکستان کو آخری تکریم ادا کی۔

اتفاق سے اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر ملتان میں تھے، جن کے اعزاز میں اہالیانِ ملتان نے ایک شاندار عصرانہ کی تقریب منعقد کی رکھی تھی۔ مگر اس حادثہ جانکاہ کی خبر سنتے ہی وہ اپنی تمام تقریبات منسوخ کرکے بصد رنج واندوہ اپنے اپنے صدر مقام کو روانہ ہوگئے جو گورنمنٹ پاکستان کی طرف سے آپ کا آخری عملی اعزاز تھا۔

گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے بحیثیت چانسلر پنجاب یونیورسٹی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی گرانقدر خدمات پاکستان کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انہیں" ڈاکٹر آف اورنٹیل لرننگ" یعنی" علامہ علوم شرقیہ" کی ڈگری پیش کی۔

علامہ موصوف چونکہ مسلمانانِ عالم کی انجمن کے صدر بھی تھے - اس لیے جہاں آپ کی وفات سے دُنیائے اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی، وہاں مسلمانانِ عالم نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات پر فخر کا اظہار بھی کیا کہ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی علماءِ حق کی ایک ایسی جماعت موجود ہے" جو اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر کے اسلام" دین اور اپنی سلطنت کے تحفظ کے لیے ہر ممکن قربانی کرنے میں پیش پیش ہے -

حکومت پاکستان نے آپ کی آخری یادگار قائم کرنے کے لیے ایک وسیع ٹکڑہ اراضی الاٹ کر دیا - جس پر ایک شاندار مسجد اور ایک دار العلوم تیار کرنے کا فیصلہ ہوا -

اتمامِ حجت

غرضیکہ جس طرح قائدِ اعظم مملکتِ پاکستان کی بنیاد رکھنے کے قریباً ایک سال بعد اس امانت کو اللہ جل شانہٗ کے سپرد کر کے جنت الفردوس کو سدھار گئے تھے، اسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانی بھی قرار دادِ مقاصد کے ذریعہ آئینِ مملکت کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم کرنے کا تاریخی فیصلہ کرانے کے قریباً نو ماہ بعد معمارِ پاکستان سے عالمِ ابدی میں جا ملے، گویا قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد حق تعالیٰ نے شیخ الاسلام کو اپنے ان فرائضِ منصبی سے جو مملکتِ پاکستان سے وابستہ تھے، سبکدوش فرما دیا اور انہیں آرام کے لیے اپنے ہاں بلا لیا -

واقعی ؎

ہر کسے بہر کارے ساختند

خیر سگالی وفد

اس زمانہ میں جب کہ علامہ شبیر احمد عثمانی خرابی صحت کی وجہ سے تمام تقریبات میں شمولیت ترک کر چکے تھے حکومت پاکستان کی طرف سے خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ نے ایک خیر سگالی وفد حج کے

موقعہ پر سعودی عرب لے جانا تھا - اس میں شمولیت کے لیے وزیر داخلہ نے علامہ عثمانی کی معذوری کے پیش نظر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو دعوت دی اور حسب ذیل دعوت نامہ ان کی خدمت میں روانہ کیا :-

وزارت داخلہ

کراچی، ۱۶ اگست ۱۹۴۹ء

مکرمی و معظمی جناب مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج میں نے عزت مآب نور الامین صاحب کو ایک تار روانہ کیا ہے - جس میں ان سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ آپ سے درخواست کریں کہ آپ پاکستانی خیر سگالی وفد کے ممبر کی حیثیت سے حج کے موقعہ پر سعودی عرب تشریف لے جانے کے لیے تیار رہیں - یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ میرے ہم سفر ہوں گے اور میں آپ کی صحبت سے مستفیض و مستفید ہوں گا - حکومت پاکستان نے آپ کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی لے جانے کی اجازت دی ہے - چونکہ وقت کم ہے اور ڈھاکہ سے آدمی کے آنے میں بحری جہاز سے کافی وقت صرف ہوگا - اس لیے میری درخواست ہے اگر آپ اسے مناسب خیال فرمائیں تو میں یہاں سے ایک بہتر ملازم کا بندوبست کر دوں اور اس کو ٹیکہ وغیرہ کے کام سے تیار رکھوں اور وہ ہماری روانگی سے کافی عرصہ قبل یہاں سے روانہ ہو جائے - اس لیے ممنون ہوں گا - اگر جناب بواپسی مجھے اپنی رضامندی سے مطلع فرمادیں -

ہماری روانگی انشاء اللہ تعالیٰ ۲۴ر ستمبر بذریعہ اورینٹ ایرویز کے جہاز سے ہوگی ۔ فقط والسلام !

کمترین !

خواجہ شہاب الدین !

چونکہ اس زمانہ میں حکومتِ ہند نے کانگریسی علماء کے ذریعہ حکومتِ پاکستان کے خلاف عرب ممالک میں ایک خاص مہم شروع کر رکھی تھی تاکہ کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی وجہ سے مسلمانانِ عالم کے دل میں حکومت ہند کے خلاف جو جذبہ پایا جاتا ہے، اسے کم کیا جائے ۔ اس لیے مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنی ذات کے لیے نہیں قوم کے مفاد کے لیے وزیر داخلہ کی مودبانہ درخواستِ شمولیت کو شرف قبولیت بخشا اور ذاتی مصروفیات ملتوی کر کے ان کے ہمراہ حجاز مقدس تشریف لے گئے جہاں اس وفد نے حکومتِ ہند کے پروپاگنڈا کا خوب ابطال کیا ۔

مذکورہ بالا خط سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ضرورت کے وقت اربابِ اقتدار علماء کرام سے کتنے ادب و احترام سے پیش آتے ہیں اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد ان کے وجود کو مملکت کے لیے غیر مفید بلکہ خطرناک ثابت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ جس کا زندہ ثبوت رسالہ "اقبال[1] اور ملاّ" ہے جو علماء کرام کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے ایک نیم سرکاری ادارہ نے شائع کر کے ملک میں تقسیم کیا ۔

تعلیمات اسلامی بورڈ

قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے مطابق بنانا لازمی ہو گیا ۔

---

[1] اس رسالہ کا جواب "اقبال اور ملّا" کے ذریعہ دیا جا چکا ہے ۔

لیکن اس مہتمم بالشان کام کے لیے ماہرین کی ضرورت تھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی تجویز پر وسط ۱۹۴۹ء میں ارباب حل و عقد نے دستوری سفارت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے پانچ علماء کا ایک بورڈ بنانا منظور کر لیا اور باہمی مشورہ سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، پروفیسر عبدالخالق صاحب اور مجتہد جعفر حسن صاحب اس بورڈ کے رکن چنے گئے۔ اس بورڈ کی صدارت کے لیے ارباب بصیرت کی نظر انتخاب مورخ اسلام جامع علوم جدید و قدیم خلیفۂ ارشد حضرت تھانویؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ پر پڑی۔ جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے ایک مرتبہ تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"آج سید سلیمان ندوی ہماری زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں۔ مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے۔ جس سے سینکڑوں نہریں نکلتی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں"۔ (معارف سلیمان نمبر ص۲)

سید صاحب اس وقت بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ڈاکٹر صاحب پیرس جا چکے تھے۔ باقی حضرات یہیں پاکستان میں موجود تھے۔ چنانچہ ان حضرات کو بلانے کے لیے نوابزادہ لیاقت علی خاں نے خط و کتابت شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب تو پیرس سے آ گئے۔ مگر سید صاحب بھوپال سے نہ آئے۔ جس کی وجہ سے بورڈ نے بلا صدر اگست ۱۹۴۹ء سے اپنا کام شروع کر دیا۔

جماعت اسلامی کی پوزیشن

۲۲ر اگست ۱۹۴۹ء کو علامہ سید سلیمان ندوی زیارت حرمین کے لیے تشریف لے گئے اور وہ فائل بھی جس میں حکومت پاکستان کے دعوت نامے اور متعلقہ کاغذات تھے، ہمراہ لیتے

دیارِ حرم میں سید صاحب کی ملاقات اپنے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندوی
ہوئی ۔ جو جماعت اسلامی کے سرگرم اور ذمہ دار رکن تھے ۔ سید صاحب نے انہیں
ت پاکستان کی طرف سے تعلیماتِ اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے کاغذات
ر بطور مشورہ ان سے دریافت فرمایا کہ " اس سلسلہ میں تمہاری جماعت کا رویہ کیا
ہوں نے استادِ محترم سے صاف کہہ دیا کہ :-

" آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی، جو جماعت کی نگاہ میں
قابل قبول نہ ہوئی تو پھر ظاہر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی ۔ آپ کی
شخصی نہیں بلکہ بورڈ کے فیصلہ کی " (معارف سلیمان نمبر صد ۱۵۲)

ظاہر ہی ہے کہ سید صاحب جیسے فاضلِ اجل اور عالم بے بدل نے اپنی صدارت میں
ایسی چیز تو منظور ہونے ہی نہیں دینی تھی، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، مگر
فرقہ کے نزدیک کتاب وسنت کے خلاف ہونا اتنا اہم نہ تھا، جتنا کہ جماعت
گاہ میں قابل نہ ہونا ۔ ورنہ اس شرط کے لگانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی ۔

جہ سلیمان ملاقات

اسی سال خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ جمہوریہ پاکستان ایک خیر سگالی وفد لے کر حجاز
ہوئے تھے ۔ خواجہ صاحب روزانہ نماز عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلّی کے پاس
سلیمان ندوی کے پہلو میں جا بیٹھتے اور خوب گفتگو ہوتی ۔ مولانا مسعود عالم ندوی
تے ہیں کہ :-

" خواجہ صاحب اوراد و اذکار کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے اور حضرت الاستاد
امورِ مملکت اور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے ۔ یہ شعوری اور مہذب مناظرہ

دونوں کے درمیان برابر جاری رہا۔ سید صاحب قبلہ کا اپنا یہ تاثر تھا کہ یہ لوگ معذور ہیں اور اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظام کا نام ہے"۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انہیں راضی کر لیں۔ سید صاحب نے انکار تو نہ کیا مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا یا عام زبان میں کوئی COMMITMENT نہ کرا سکا۔ ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذ کو سادہ لوح سمجھتے تھے۔ یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف ان کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروّت تھی۔ معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے"۔ (بحوالہ صدر)

وزیرِ اعظم کا اضطراب

سید صاحب جب ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو حج سے فارغ ہو کر واپس ہندوستان لوٹے، تو اس وقت علامہ شبیر احمد عثمانی رحلت فرما چکے تھے۔ جس کی وجہ سے اب ارکان بورڈ اور خود حکومت سید صاحب کی آمد کے لیے بے حد بیتاب تھی۔ ادھر سید صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی اس حالت کی کیفیت اپنے مسترشد غلام محمد صاحب عثمانیہ کو یوں لکھی کہ:۔

"حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لیے احباب مصر ہیں۔ اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعف قویٰ سے بھی اور طبیعت کے اقتضا سے بھی اختلاف و منازعت سے گھبراتا ہوں"۔ (مکتوب مورخہ ۸ار جنوری ۱۹۵۰ء)

منقول از ماہنامہ "ریاض" مارچ ۱۹۵۴ء)

آخر نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے مجبوراً مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی سید صاحب کی خدمت میں بھوپال بھیجا۔ انہوں نے تمام ملکی و ملی حالات سنائے اور حکومت کی نیک نیتی اور مخلصانہ انتظار کا یقین دلایا۔ جس پر سید صاحب نے پاکستان تشریف لانے کا وعدہ فرما لیا۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے وزیر اعظم کو اپنے کامیاب واپس آنے کی اطلاع دی جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔

مودودی صاحب کی مایوسی

۲۸ر مئی ۱۹۵۰ء کو جناب مودودی صاحب اپنے رفقاء سمیت ۲۰ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے۔ اسی عرصہ میں علامہ سید سلیمان ندوی حکومت پاکستان کی پُر اصرار دعوت پر اپنے آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائیداد، اثاث البیت، نظام دکن کا وظیفہ، ریاست بھوپال کا پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ سب کچھ ہندوستان چھوڑ کر اپنے عزیز سید سلمان سلمہٗ کے ساتھ ہجرت کے مصائب برداشت کرتے ہوئے لاہور پہنچے۔ جناب مودودی صاحب اس امر سے آگاہ ہو چکے تھے کہ سیّد صاحب کو تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ وہ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اگر سیّد صاحب نے یہ پیش کش منظور نہ کی، تو شاید یہ اعزاز انہیں بخش جائے۔ جس کے لیے ان کی جماعت بلطائف الحیل کوشاں تھی۔ اس لیے جونہی مودودی صاحب کو سیّد صاحب کے لاہور پہنچنے کی خبر ملی انہوں نے سیّد صاحب کو اپنے ہاں چائے کی دعوت پر مدعو کیا۔ اس دعوت کے موقعہ پر مودودی صاحب نے سیّد صاحب سے سفر کے کوائف پر کوئی تفصیلی گفتگو نہ کی کہ کس حال میں ہندوستان

چھوٹا؟ سفر کیسے کٹا؟ کس حالت میں یہاں پہنچے؟ گذر اوقات کی اب کیا صورت ہوگی وغیرہ۔ کیونکہ اس قسم کے ہمدردانہ خانگی نوعیت کے سوالات کی ان کی نظر میں خاص اہمیت ہی نہیں تھی۔ البتہ ان کے نزدیک جو اہم ترین سوال تھا، وہ انہوں نے بڑی بے تابی سے پوچھا کہ:۔

"کیا آپ نے بورڈ تعلیمات اسلامی کی صدارت کی پیش کش قبول فرمالی ہے؟"

سیّد صاحب نے نہایت متانت مگر ظرافت سے مودودی صاحب کو یہ جواب دے کر مایوس کر دیا کہ:۔

"ایجاب ہو چکا ہے، قبول باقی ہے"۔

سیّد صاحب کی آمد کراچی

سیّد صاحب جب لاہور پہنچے تو ان کے پاس زادِ راہ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے دارالمصنفین کے مقامی ایجنٹ سے مبلغ دو صد روپے ادھار لیے اور چند کپڑوں کے جوڑوں کے ساتھ ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کو کراچی پہنچ کر اپنے بڑے داماد سید ابوعاصم صاحب ایڈووکیٹ کراچی کے ہاں ڈار منزل جمن سٹریٹ نیو ٹاؤن میں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے "علماء" کی طرح اپنے لیے کوئی کوٹھی، بنگلہ یا مکان الاٹ نہ کرایا بلکہ "اقتدار پسند مولویوں" نے جو تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت کا اعزاز خود حاصل کرنا چاہتے تھے سیّد صاحب کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور اربابِ اقتدار کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش کرنے میں منہمک ہو گئے۔

سیّد صاحب جس وقت کراچی پہنچے تھے، اس وقت نوابزادہ لیاقت علیخاں وزیراعظم پاکستان امریکہ کے دورہ پر جا چکے تھے۔ وہ بہت دیر سے واپس آئے۔ ان

کے واپس آنے پر سید صاحب کی ان سے فوری طور پر ملاقات نہ ہو سکی۔ بلکہ معاندین نے جن میں بقول سید عاصم صاحب ایڈووکیٹ ایک وزیر باتدبیر بھی شامل تھا۔ ملاقات کا موقع ہی نہ آنے دیا۔

واپسی کا ارادہ

سید صاحب سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر یہاں کسی ذاتی مفاد یا اعزاز کی خاطر تشریف نہیں لائے تھے، نہ وہ اس بورڈ کی صدارت کے متمنی تھے نہ انہیں اس بورڈ کی سفارشات کی بنا پر دستور بننے کی توقع تھی۔ ان کے پیش نظر تو اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کی خواہش کے مطابق قائم ہونے والے پاکستان کے آئین کو دینی بنیادوں پر استوار کرانے کی مہم تھی۔ جس طرح ان کے شیخ نے ارباب مسلم لیگ کو دیندار بنانے کی سعی کی تھی، اسی طرح سید صاحب بھی ارباب اقتدار کو پاکستان کے آئین کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھنے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ جن کے دلی ارادے کچھ اور تھے۔ جیسا کہ ان کے ایک خط بنام سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہے۔

"یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے۔ مسلمانوں سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدم ہے"۔ (معارف سلیمان نمبر صـ ۲۴)

مگر یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ:۔

"حکومت کو محض ان کے نام کی ضرورت ہے، کام مطلوب نہیں اور کہ یہاں کا ماحول مصالحانہ خدمت کے لیے سازگار نہیں بلکہ مخالفانہ جدوجہد کی ضرورت ہے"۔

اس پر سیّد صاحب نے ہندوستان واپس جانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس غرض کے لیے پوری تیاری کر لی۔ جب سیّد صاحب کے مخلصین و متوسلین کو اس بات کا پتہ چلا، تو انھوں نے سیّد صاحب کو روک لیا۔

جنگِ اقتدار کی تیاری

مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کے جیل سے رہا ہونے سے قبل قرار دادِ مقاصد منظور ہو چکی تھی۔ جماعت اسلامی مودودی صاحب کی گرفتاری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے قرار دادِ مقاصد کی آڑ میں حکومت کے خلاف کافی پروپاگنڈا کر چکی تھی اور اسے یہ بزعم خود یقین ہو چکا تھا کہ عوام حکومت کے خلاف بغاوت کرنے میں اس کا ساتھ دیں گے اس لیے اس نے ایوانِ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے یوں زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی کہ :-

"جماعت کی اپنی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ فاسد قیادت کو صالح قیادت سے بدلے۔ وہ اپنے لیے کسی طرح اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ زندگی کے سارے معاملات فاسقین کے ہاتھوں میں رہیں اور وہ گوشۂ خمول میں پڑی رہے اگر ذمہ داری کو ادا کرنے کی وجہ سے اس پر جاہ پسندی کا الزام عائد کیا جائے تو یہ بہر حال اس کام کے کرنے والوں پر ہمیشہ عائد کیا ہی جاتا رہا ہے۔ حضرت موسےٰؑ و حضرت ہارونؑ کی دعوتِ انقلاب کو سن کر فرعون نے بھی یہی کہا تھا۔"

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۰ء)

جیل کی ہوا کھانے کے بعد مودودی صاحب کے نظریات میں پھر ایک انقلاب آیا۔ جہادِ پاکستان کی مہم کو ناکام بنانے کے لیے تو انھوں نے اس وقت الیکشن میں حصّہ لینے کو

حرام قرار دیا تھا۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے حرام کو حلال قرار دیتے ہوئے انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا اور عین اسی دن یعنی ۱۴ر جون ۱۹۵۰ء کو جس دن کہ سید سلیمان صاحب کراچی پہنچے، مودودی صاحب نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے ۱۹۵۱ء کے انتخابات لڑنے کے لیے یہ اعلان کیا کہ :۔

"پنجاب کے انتخابات میں ہم پوری قوت سے شریک ہوں گے اور اس بات کی کوشش کریں گے کہ زیادہ سے زیادہ صالح لوگ منتخب ہوں۔"

(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۵۰ء)

تاکہ جنگِ پاکستان جیتنے والی مسلم لیگ ناکام رہے اور یہ صالحین زمامِ اقتدار سنبھال سکیں۔ جیسا کہ جناب مودودی صاحب کے دستِ راست جناب محمد امین احسن صاحب اصلاحی کے اس بیان سے ظاہر ہے جو انہوں نے تحقیقاتی عدالت کے رُو برو دیا کہ :۔

"اصلاحِ انسانیت کی کوئی سکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک مصلحین سیاسی اقتدار حاصل نہیں کر لیتے۔ اگر مسلمانوں کے اخلاقی اور مذہبی حالات میں اصلاح مقصود ہے، تو مصلح کو سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہیئے۔"

(نوائے وقت مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۵۳ء صا)

تفاوتِ راہ

حالانکہ جماعتِ اسلامی کا یہ نظریہ قطعاً غیر اسلامی ہے جس کی خود قرآن یوں تردید کرتا ہے کہ :۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ نے ان
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ	سے وعدہ کیا ہے کہ (ایک نہ

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۝

ایک دن) ان کو ضرور ملک میں حکومت دے گا، جیسا اپنے اگلے لوگوں کو ان سے پہلے حکومت دی تھی۔

ورنہ یہ وعدہ یوں ہوتا کہ اگر تم سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، تو تب تمہاری اصلاح انسانیت کی کوششوں کو بار آور کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جماعتِ اسلامی سے کئی گنا زیادہ اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ تقویٰ اور اہلِ عقیدت رکھنے کے باوجود اقتدار سنبھالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بلکہ اربابِ اقتدار کو دیندار اور دیانتدار بنانے کی کوشش کی تھی اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی واضح الفاظ میں اربابِ اقتدار کو یقین دلایا تھا کہ:-

"آپ بے فکر ہو کر کام کریں۔ ہم آپ کی کرسیاں نہیں چھیننا چاہتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح پہلے آپ نے انگریزی نظامِ حکومت میں تمام انگریزی قانون اور قاعدے سیکھے ہوئے تھے، اسی طرح پاکستان کی اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے بقدرِ ضرورت اسلامی قانون سیکھ لیں تاکہ آپ خود بہ اطمینان یہ کام چلا سکیں۔" (اقبال اور ملّا)

کیونکہ یہ تخت و تاج، حکومت و اقتدار اولیاء و علماء کی شان کے شایاں نہیں ہوتے۔ یہ دنیا داروں کو ہی زیب دیتے ہیں، ورنہ ہمارے وہ مقتدر آئمہ کرام جنہیں بعض حکومتوں نے ذمہ دار عہدے قبول نہ کرنے کے جرم میں سخت سے سخت سزائیں دیں، بہ طیبِ خاطر اس "خدمت" کے لیے تیار ہو جاتے۔

شانِ استغناء

علامہ سید سلیمان ندوی کو جب احباب نے ہندوستان واپس جانے سے روک لیا، تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد ان کی نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان سے ملاقات ہوئی ۔ وزیر اعظم نے بورڈ تعلیمات اسلامی کی صدارت اور مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی ۔ سید صاحب نے فرمایا کہ سب سے پہلے شرائط تقرر طے ہونی چاہئیں ۔ یہ بعد کی چیزیں ہیں وزیر اعظم نے فرمایا کہ نہیں، آپ پہلے شرکت قبول کر لیں ۔ پھر سب کچھ طے ہو جائیگا ۔ مگر سید صاحب نے نوابزادہ صاحب کے اصرار کے باوجود طریق کار کا تصفیہ کیے بغیر بورڈ میں شرکت قبول نہ کی ۔ کیونکہ انہیں احتمال تھا کہ جو کچھ علماء و عوام چاہ رہے ہیں، ارباب اقتدار نہیں چاہتے ۔ اس لیے انہوں نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد قربان کرتے ہوئے گرانقدر پیش کش کو ٹھکرا دیا اور "مکتبہ الشرق" قائم کر کے کتب فروشی کرنے لگے اور اس طرح دو سوا دو سال معاشی پریشانی میں گذار دیئے ، مگر عالمانہ وقار و شانِ استغناء پر حرف نہ آنے دیا ۔

ٹھوس کارنامہ

سید صاحب کو اس بات پر اصرار تھا کہ جب تک مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں نہ ڈھالا جائے ۔ تنہا دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی ۔ اگر حکومت نیک نیتی سے پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی سلطنت بنانا چاہتی ہے، تو اسے فی الفور قوانین کو اسلامی قالب میں ڈھال کر اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینا چاہیے ۔ جن سے عوام کو شب و روز واسطہ پڑتا ہے ۔ وزیر اعظم صاحب تو سید صاحب کو شیشہ میں نہ اتار سکے، مگر سید صاحب وزیر اعظم سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے اور اواخر ۱۹۵۰ء میں

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مروّجہ قوانین پر نظرِ ثانی کرنے اور ان کو اسلامی قانون کے معیار میں لانے کے لیے ایک لاء کمشن مقرر کر دیا۔ جس کے جسٹس رشید احمد جسٹس میمن اور سیّد صاحب رکن مقرر ہوئے۔ چونکہ اس کمشن کے قیام کے بعد قانون اسلامی کی تمام تر ذمہ داری تنہا سیّد صاحب پر عائد ہوتی تھی۔ کیونکہ دوسرے دو ممبر عالم قانون تھے، عالم دین نہ تھے۔ اس لیے سیّد صاحب نے از راہِ حزم و احتیاط نوابزادہ صاحب کو کہہ کر حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ارشد اور علامہ عثمانی کے شاگرد رشید مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) کو بھی اس لاء کمشن کا ممبر بنوا دیا۔ جو اس معاملہ میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے تھے۔

بنیادی سفارشات

اس وقت تک تعلیمات اسلامی بورڈ اپنی رپورٹ مکمل کر چکا تھا۔ اس لیے سیّد صاحب نے اب محض تنخواہ کے لیے بورڈ میں شرکت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب کہ اب ان کے لیے وہاں کوئی کام ہی نہ رہا تھا۔ البتہ انہوں نے بورڈ میں شرکت کیے بغیر بورڈ کی رپورٹ بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے لکھ دی۔ مگر چونکہ وہ رپورٹ ارباب اقتدار کے مزاج کو راس نہ آئی۔ اس لیے انہوں نے اسے بستۂ خاموشی میں بند کر دیا۔ اور بنیادی اصولوں کی پہلی کمیٹی کی سفارشات کو شائع کر دیا۔ جن میں برطانوی پارلیمانی سسٹم کو اسلامی اصولِ آئین کے مطابق بنانے کی سعیٔ ناکام کی گئی تھی۔ اس سے ارکانِ بورڈ کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے کہ در اصل ارباب اقتدار اسلامی آئین بنانا ہی نہیں چاہتے۔ وہ محض عوام کی تسلّی کے لیے ایسے بورڈ قائم کر کے اپنے "اسلامی ارادوں" کی نمائش کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ارکانِ بورڈ سخت بے دل ہو گئے۔

اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب احتجاجاً بورڈ سے استعفیٰ دے کر واپس پیرس چلے گئے۔ اگرچہ اب سیّد صاحب کی بورڈ میں شرکت کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی، مگر نوابزادہ صاحب کا اصرار بدستور باقی تھا۔

اعتراض واستہزاء ادھر اس عنصر کے زیر اثر جو پاکستان میں آئینِ اسلامی رائج کرنے کے خلاف تھا۔ بعض اربابِ اقتدار یہ نعرے لگا رہے تھے کہ:۔

الف: بورڈ تعلیمات اسلامی کوئی معقول رپورٹ پیش نہیں کر سکا۔

ب: اسلام کا کوئی دستورِ مملکت نہیں ہے نہ ہی اس بارے میں اس کے کوئی اصول ہیں۔

ج: قرآن میں دستورِ مملکت کے متعلق ایک لفظ موجود نہیں ہے[1]۔

د: عہدِ اسلام میں کبھی قرآن کی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی۔

جائز مطالبہ بعض اربابِ اقتدار کے ان اعتراضات نے عوام کو عجیب قسم کی ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا، جسے دور کرنے کے لیے پاکستان کے پریس اور پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کی گئی کہ اگر بورڈ تعلیمات اسلامی کوئی معقول سفارشات پیش نہیں کر سکا، تو اسے عوام کی آگاہی کے لیے شائع کر دیا جائے تاکہ عوام خود فیصلہ کر سکیں کہ حکومت کا الزام کہاں تک صحیح ہے۔ اس کی اشاعت سے خود حکومت کے مؤقف کی بھی تائید ہو جاتی، مگر چونکہ معاملہ برعکس تھا، وہ رپورٹ عین اسلامی اصولوں کے مطابق، مگر اربابِ اقتدار کے مزاج کے خلاف تھی، اس لیے حکومت نے کسی قیمت پر بھی اس بورڈ کی سفارشات کو شائع نہ کیا۔ خود راقم نے

بورڈ کے رکن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی سے مطالبہ کیا کہ جب طبقۂ علماء کے خلاف اس قسم کی بدظنی پھیلائی جا رہی ہے، تو آپ خود اس رپورٹ کو عوام کی آگاہی کے لیے شائع کر دیں تاکہ حقیقت واضح ہو جائے مگر انہوں نے لکھا کہ :-

تقاضاءِ دیانت

"گرامی نامہ سے مسرور فرمایا۔ آپ کی ہمدردی کا ممنون ہوں میرے خیال میں جہاں تک دیانۃً ہمیں کام کرنا ضروری تھا وہ ہم نے کر لیا ہے۔ کیونکہ میں یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ ہمارے ذمہ اصل کام تو یہ تھا کہ اپنے علم و فراست کے مطابق صحیح اسلامی اصول پیش کر دیں اور دوسرا کام حکومت کے غلط رویہ نے یہ بھی ہمارے ذمہ عائد کر دیا کہ وہ ہمارے ذریعہ عوام کو مغالطہ نہ دے سکیں۔ سو اوّل امر کے متعلق جتنا حصّہ مرتب ہوا، اس پر ہم نے بلاخوف لومۃ لائم اپنی بصیرت کے موافق چیزیں پیش کر دیں۔ دوسرا کام ایک متفقہ بیان سے اور پھر میں نے اپنے بیان سے کر دیا۔ اب اگر کسی شخص کو خود ہم پر یہ بدگمانی ہو کہ ہم نے غلط اصول پیش کیے ہوں گے، تو اس کی صفائی پیش کرنا کم از کم میں تو غیرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ جن کو ایسی بدگمانی ہو، وہ ہماری بات نہ مانیں انہیں اختیار ہے۔

رہا سفارشات کی اشاعت، سو اس کا مطالبہ حکومت سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہم اگر ایسا کریں تو جب تک ہم نے اس ذمہ داری کو اپنے سر رکھنا صحیح سمجھا ہوا ہے اور اس کو ہم انجام دے رہے ہیں، ہمارے لیے ایسا کرنا قطعاً مناسب نہیں اور یہ بھی کسی خوف یا طمع کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس کو ہم اصل مقصد

کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔" (مشاہدات و واردات ص۲۱۲)

سیاستِ علماء مجلس تعلیمات اسلامیہ کی سفارشات کے انحفاد کو علماء اشرفیہ نے ایک چیلنج سمجھا۔ اربابِ اقتدار تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ اس رپورٹ کے انحفاد کو اسلامی آئین کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف ایک حربہ کے طور پر استعمال کریں گے۔ مگر علماء کرام نے اس حرکت کا ایک ایسا جواب دیا۔ جس کی مثال تاریخ علماء میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی اور جس نے حکومت کو ایک ایسی دلدل میں پھنسا دیا۔ جس سے اسے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

اجتماع علماء اربابِ اقتدار کے اس اعتراض کا کہ:۔

"اسلام کا کوئی دستورِ مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں؟ اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے، جس پر تمام اسلامی فرقوں کے علماء متفق ہو سکیں۔"

جواب دینے کے لیے مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے کراچی میں تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ وہ ایک ایسا دستوری خاکہ مرتب کر دے، جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

اس غرض کے لیے ۲۱، ۲۲، ۲۳، اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو ملک کے ہر طبقہ کے مندرجہ ذیل ۳۱ علماء کرام کا ایک اجتماع بصدارت علامہ سید سلیمان ندویؒ منعقد ہوا۔

۱۔	علامہ سید سلیمان ندوی	سابق مدیر رسالہ "معارف" اعظم گڑھ
۲۔	مولانا مفتی محمد حسن امرتسری	مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور
۳۔	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی	رکن بورڈ تعلیمات اسلام
۴۔	مولانا خیر محمد جالندھری	مہتمم خیر المدارس ۔ ملتان
۵۔	مولانا اطہر علی	صدر عامل جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان
۶۔	مولانا احتشام الحق تھانوی	مہتمم دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد سندھ
۷۔	مولانا محمد ادریس کاندھلوی	شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور
۸۔	مولانا شمس الحق فرید پوری	صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ۔
۹۔	مولانا محمد یوسف بنوری	شیخ التفسیر دار العلوم اسلامیہ اشرف آباد
۱۰۔	مولانا محمد بدر عالم	استاذ الحدیث " "
۱۱۔	مولانا شمس الحق افغانی	وزیر معارف ریاست قلات
۱۲۔	قاضی عبد الصمد سربازی	قاضی قلات ۔ بلوچستان
۱۳۔	مولانا ابو جعفر محمد صالح	امیر حزب اللہ مشرقی پاکستان
۱۴۔	مولانا حبیب اللہ	جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹیڑھی ۔ خیر پور میر
۱۵۔	مولانا محمد صادق	مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ ۔ کراچی
۱۶۔	مولانا راغب احسن	نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان
۱۷۔	مولانا محمد حبیب الرحمٰن	نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

۱۸۔ مولانا احمد علی	امیر انجمن خدام الدین لاہور
۱۹۔ مولانا محمد علی جالندھری	صدر مجلس احرار پاکستان
۲۰۔ مولانا محمد عبدالحامد بدایونی۔	صدر جمیعۃ علماء پاکستان
۲۱۔ مولانا مفتی صاحب داد	مدرسۃ الاسلام سندھ۔ کراچی
۲۲۔ پیر محمد ہاشم مجددی	ٹنڈو سائیں داد، سندھ
۲۳۔ مولانا داؤد غزنوی	صدر جمیعۃ اہل حدیث مغربی پاکستان
۲۴۔ مولانا محمد اسماعیل	ناظم " " " "
۲۵۔ مفتی جعفر حسین مجتہد	رکن بورڈ تعلیمات اسلام
۲۶۔ مفتی کفایت حسین مجتہد	ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان
۲۷۔ پیر محمد امین الحسنات	مانکی شریف
۲۸۔ حاجی خادم الاسلام محمد امین	خلیفہ حاجی ترنگ زئی
۲۹۔ مولانا ظفر احمد انصاری	سیکرٹری بورڈ تعلیمات اسلام
۳۰۔ پروفیسر عبدالخالق	رکن " " "
۳۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی	امیر جماعت اسلامی پاکستان

مودودی صاحب کا اعتراض

مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کو مختلف الخیال علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں عظیم دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر سب کو ایک جگہ جمع کر کے پہلو بہ پہلو بٹھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ آغاز کار ہی میں یہ تجویز ہوئی کہ اس اجتماع کے فیصلہ کو مطالبہ کی صورت میں حکومت پاکستان کے

سامنے رکھا جائے ۔ لیکن جونہی ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی، مودودی صاحب بگڑ بیٹھے اور فرمانے لگے کہ چونکہ یہ اجتماع اپنا فیصلہ مطالبہ کی شکل میں حکومتِ پاکستان کے سامنے رکھنا چاہتا ہے ۔ اس لیے میں ایسے اجتماع کی کارروائی میں حصّہ نہیں لے سکتا ۔ کیونکہ میرا حکومت سے مطالبہ کرنے والے اجتماع میں شریک ہونا ۔ اس حکومت کو تسلیم کرنا ہے ۔ جسے جماعت اسلامی بے دین حکومت سمجھتی ہے ۔ اس پر سب ششدر رہ گئے ۔ مولانا احتشام الحق صاحب اور ان کے ہم خیال علماء کی یہ امکانی کوشش تھی کہ کوئی ٹوٹنے نہ پائے ۔ اس لیے انہوں نے جناب مودودی صاحب کو شریکِ اجلاس رکھنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں حکومت سے اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کرنے کی لیے کام نہیں کرنا چاہیے ۔ بلکہ اس غرض کے لیے کام کرنا چاہیے کہ اگر کسی وقت دُنیا کے کسی حِصّہ میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو جائے ۔ تو ایسی حکومت کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں ۔ اسی لیے مولانا احتشام الحق صاحب نے اس اجتماع کی رپورٹ

"اسلامی مملکت کے بنیادی اصول"

کے نام سے شائع کی ۔ جس میں "پاکستان" یا "مطالبہ" کا ذکر تک نہیں ۔ اگر علماء کرام نیک نفسی ۔ بے غرضی اور موقع شناسی سے کام نہ لیتے، تو جناب مودودی صاحب کا شمولیت سے انکار ۔ افتراق کا باعث ہوتا ۔

بنیادی اصول

ملک کے تمام مذہبی فرقوں کے ان مقتدر نمائندوں نے متفقہ طور پر ایک اسلامی مملکت کے لیے بنیادی اصول تجویز کر کے اتفاق و اتحاد کی ایک بے مثل یادگار قائم کر دی ۔ وہ بنیادی اصول حسب ذیل تھے ۔

۱ ۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العلمین ہے ۔

۲- ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا۔ نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔
(تشریحی نوٹ: اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں، جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں، تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ بتدریج ایک معیّنہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

۳- مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصوّر پر نہیں بلکہ اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی۔ جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے۔ منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶- مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی، جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷۔ باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان، مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبادت، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقعۂ صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا کرنا مناسب ہو گا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہو گی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہو گا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہو گی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے۔ ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک

ہوں گے ۔

۱۲۔ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے ۔جس کے تدین ۔صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو ۔

۱۳۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا ۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے ۔

۱۴۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی ۔یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا ۔

۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے ۔

۱۶۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی ، وہی کثرتِ آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی ۔

۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا ۔

۱۸۔ ارکان و عمّالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی ۔

۱۹۔ محکمۂ عدلیہ ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو ۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی ، جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں ۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات واقطاعِ مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہو گی، جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

خراجِ تحسین

جس کام کو اربابِ اقتدار چار سال کے عرصہ میں نہ کر سکے۔ وہ مختلف الخیال علماء نے صرف چار دن کے اندر مکمل کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ جس پر ہر طرف سے تحسین وآفرین کے پیغام اور تار صدرِ مجلس علامہ سید سلیمان ندوی کو موصول ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ اربابِ اقتدار جو علماءِ کرام کو سیاست سے بے بہرہ سمجھتے تھے، ان کے اس بے مثال تاریخی کارنامہ پر سید صاحب کو مبارکباد پیش کرنے پر مجبور ہوگئے اور اس طرح علماء کی سیاست نے اربابِ اختیار کی سیاست کو شکست فاش دے کر قریباً اسلامی بنیادی اصولوں کو عالم آشکارا کر دیا، جن کی بورڈ تعلیمات اسلامی نے بھی سفارش کی تھی اور جنہیں حکومت نے پردۂ اخفاء میں رکھا ہوا تھا۔ اور علماء کی اس نمائندہ مجلس کو، صدرِ مجلس کی درخواست کے باوجود دکھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ علماءُ کے اس متفقہ فارمولانے حکومت کے شائع کردہ بنیادی اصولوں کے پرخچے اڑا دیئے اور ان کا حشر وہی ہوا جو نہرو رپورٹ کا ہوا تھا۔

دستورِ قرآنی

تیسرا چیلنج مسٹر پرویز کا تھا کہ قرآن میں دستورِ مملکت کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ اس کے جواب میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ایک رسالہ "دستورِ قرآنی" لکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے حکومت کے

اغراض و مقاصد، طرزِ حکومت، فرائض حکومت، اوصافِ صدرِ مملکت وغیرہ کے متعلق ۱۸ دستوری دفعات کو قرآنِ کریم سے بالاجمال پیش کر کے ثابت کیا کہ جس دستورِ اسلامی کا مطالبہ پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے وہ صرف ماہرین شریعت علماء و فقہاء کے اجتہادات و قیاسات پر مبنی نہیں، بلکہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔

اعجازِ قرآنی

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں اس وقت جماعت اسلامی جیسی منظم جماعت اور کوئی نہیں۔ اس کے سوا باقی تمام جماعتوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ انہیں میں جمیعۃ العلماء اسلام بھی شامل ہے۔ مگر حیرت ہے کہ جس قدر کام مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے معدودے چند رفقاء نے سرانجام دیا۔ وہ نتیجہ کے لحاظ سے اس منظم جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ان کے پاس اسلامی جماعت جتنا فنڈ اور کارکن ہوتے، تو نتیجہ کچھ اس سے بھی مضاعف ہوتا۔ وہاں تو یہ حالت تھی۔ جیسا کہ مولانا موصوف اپنے ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"دستوری مہم کے اتنا مصارف ہیں کہ عرض کرنا دشوار ہے۔ اپنے اوپر کہاں تک برداشت کروں۔ جو کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے اس کو دستوری مہم پر خرچ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔"

ایسے حالات میں انہوں نے وہ رسالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کثیر تعداد میں شائع کر کے ارکانِ اسمبلی، اربابِ حکومت اور متعلقہ حضرات اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مفت تقسیم کیا۔ پھر اسمبلی کے ایام میں ممبرانِ اسمبلی و وزراء کو ملنا، ان کے اعتراضات کا جواب دینا، بعض مخلص اور ہمدرد ممبرانِ دستوریہ کو اپنے ہاں بلانا، اسمبلی میں اٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات تیار کرانا، غرضیکہ وہ شب و روز اسی دھن میں ...

میں لگے رہتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

الف: دستور ساز اسمبلی میں اسلامی آئین پر بعض ممبران نے اور خصوصاً سردار عبدالرب نشتر نے ایسی پُر مغز و پُر معلومات تقاریر کیں کہ ہندو ممبران بوکھلا اُٹھے اور کہنے لگے کہ ہم یہاں اسلامیات پر لیکچر سننے نہیں آئے۔

ب- وہی مسٹر پرویز جو قرآن میں دستورِ مملکت کی موجودگی کے منکر تھے بلکہ اس کو ثابت کرنے والے کو انعام دینے کا اعلان کر چکے تھے، اوّلین دستور یہ میں بطور وزیر قانون آئین مملکت پیش کرتے ہیں اور اس کے تیسرے باب کی یہ دفعات پیش کر کے منظور کراتے ہیں:-

دفعہ ۴: کسی مجلس قانون ساز کو قرآن پاک اور سنت رسول کے خلاف قانون سازی نہ کرنی چاہیئے۔

دفعہ ۵: قرآن پاک اور سنت کے الفاظ جہاں جہاں آئے ہیں، اُن کا کسی فرقہ پر اطلاق کے وقت مفہوم وہی لیا جائے گا، جو اس فرقہ کے نزدیک صحیح اور مُسلَّم ہو۔

دفعہ ۶: یہ اختیارات صرف سپریم کورٹ کو حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کوئی قانون قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہے یا ان کے مطابق۔

دفعہ ۷: مملکتِ پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ کسی بھی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بناء پر چیلنج کر سکے۔

دفعہ ۸: یہ درخواست مسودۂ قانون کی منظوری سے تین ماہ کے اندر دائر ہونی چاہیئے۔

دفعہ ۹: سپریم کورٹ کی فل بنچ جو کم سے کم پانچ ججوں پر مشتمل ہو۔ اس مقدمہ کی سماعت کرے گی اور اس بات کا فیصلہ کہ کوئی قانون خلافِ قرآن پاک و سنت ہے، یا

نہیں، ان کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔

دفعہ ۱۱ : ایک ایسے ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو عوام الناس کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔

قرآن کے نام پر آئین اسلام سے انکار و استکبار کرنے والے کی زبان و قلم سے قرآن کے مطابق یہ دفعات پیش کر کے پاس کرانا انتقامِ قدرت، یا اعجازِ قرآن یا علماء کرام کی مخلصانہ جد و جہد کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔

قرآنی حکومت

"قومی آواز" کے نمائندہ کے اس استفسار کے جواب میں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا سیکولر یعنی غیر مذہبی؛ وزیر داخلہ جنرل سکندر مرزا نے یہ جواب دیا تھا کہ :-

"اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں آپ ہی بتائیے، کسی ملک میں بھی حکومت کی بنیاد قرآن پر رہی ہے؛ اور اگر کسی دَور میں اسلامی حکومت اس سے پہلے نہیں ہوئی ہے، تو آج کیسے ہو سکتی ہے؟" (صدق جدید جلد ۴ نمبر ۵ صہ ۲)

ارباب اقتدار کی طرف سے یہ چوتھا اعتراض تھا، جس کا جواب حضرت تھانویؒ کے فیض یافتہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے دیا کہ :-

"ادوارِ ذیل میں تو قرآن برابر آئین سلطنت کا کام دیتا رہا ہے :-

۱- محمد رسول اللہ ﷺ (۶۲۸ء یا ۶۳۲ء) جب رقبہ حکومت ۱۰ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول نجد۔ حجاز۔ یمن وغیرہ۔

۲- ابو بکر صدیقؓ۔ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) جب رقبہ حکومت ۱۲ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول عراق و شام جنوبی وغیرہ۔

۳- عمر فاروقؓ۔ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) جب رقبۂ حکومت ۲۷ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول ایران، شام شمالی، مصر، طرابلس وغیرہ۔

۴- عثمان غنیؓ۔ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) جب رقبۂ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول شمالی افریقہ و مغربی جزائر بحیرہ روم وغیرہ۔

۵- علی مرتضیٰؓ۔ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء)۔ جب رقبۂ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول شمالی افریقہ و مغربی جزائر بحیرہ روم وغیرہ

۶- حسن بن علیؓ (۶۶۱ء تا ۶۶۳ء) جب رقبۂ حکومت ۳۵ لاکھ میل مربع تھا۔ بشمول افریقہ مشرقی و جزائر بحیرہ روم وغیرہ۔

۷- عمر بن عبدالعزیزؒ۔ (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) جب حدود سلطنت کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ بشمول افغانستان، کردستان، ترکستان، خراسان، اسپین وغیرہ۔

یہ تو تاریخ کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ورنہ ان کے علاوہ بھی کیا ہندوستان اور کیا عراق اور کیا شام اور کیا اسپین، ہر مسلم ملک کے بیسیوں فرمانروا اپنے آئین حکومت کو قرآن سے قریب لانے کی کوشش کم و بیش کامیابی کے ساتھ کرتے رہے اور پھر سب سے بڑھ کر روشن مثال تو آج کی مملکت حجاز کی ہے۔ نجد و حجاز کا دستور العمل آج بھی قرآن ہی ہے اور ابھی ڈیڑھ ہی چار سال کی بات ہے کہ جب امریکہ میں ساری دنیا کے ملکوں کے آئین اکٹھے کئے جا رہے تھے۔ تو اس کی مانگ پر سلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم نے اپنے ہاں سے قرآن ہی بھجوا دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ ہمارا آئین و دستور یہی ہے۔

آئیڈیل (مثالی نصب العین) کوئی سا بھی ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس کے ماننے والے ایک ایک جزئیہ میں اس پر چلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ بلکہ جو نصب العین جتنا زیادہ بلند ہوگا اسی نسبت سے اس کی پیروی بھی دشوار اور ہمت طلب ہوگی۔ لیکن اس سے اس کے مطلوب و مقصود ہونے پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا"

(صدق جدید جلد ۴ نمبر ۵۰ صہ ۲)

ہوائی قلعے گویا اسلامی آئین کی تیاری اور نفاذ کے خلاف ارباب اقتدار نے جس قدر بھی استدلال کے ہوائی قلعے تیار کئے تھے۔ ان گوشہ نشین سیاست سے باواقف "علماء اشرفیہ نے حقائق و شواہد کی توپوں سے سب گرا دیئے اور اب ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ علماء اور عوام کے متفقہ فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئین اسلامی بنائیں۔

شہادت لیاقت ارباب اقتدار میں سے جو اس سلسلہ میں زیادہ مخلصانہ کوشش کر رہے تھے، وہ قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان تھے اور وہی علماء کے متفقہ فارمولا سے زیادہ خوش اور مطمئن تھے۔ کیونکہ یہ ان کی پاس کرائی ہوئی قرارداد مقاصد کے عین مطابق تھا۔ مگر وہ اسی سال یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ایک طبقہ کے خیال کے مطابق ایک ایسی گہری سازش کے ماتحت شہید کرا دیئے گئے جس کا آج تک کوئی پتہ نہیں لگ سکا۔ ان کی شہادت سے قوم کے لیے ایک آزمائشی دور شروع ہوا۔ ملک کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان خواجہ ناظم الدین نے سنبھال لیا اور جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان مقرر ہوئے۔

بورڈ میں شرکت پہلی دستوری رپورٹ چونکہ مسترد ہو چکی تھی۔ اس لیے اب

از سرِ نو دستوری سفارشات مرتب کرنے کا کام شروع ہوا اور سید سلیمان ندوی کی بورڈ تعلیماتِ اسلامی میں شرکت لازمی سمجھی گئی۔ اس غرض کے لیے نہ صرف سید صاحب کے احباب نے، بلکہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رئیس الخلفاء دربارِ اشرفیہ نے بھی سید صاحب سے ان الفاظ میں تقاضا کیا کہ:

"آپ انجن ہیں ہم سب ڈبے ہیں۔ بغیر انجن کے گاڑی نہیں چل سکتی"۔

ادھر حکومت بھی وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر سید صاحب کی شرائط ماننے پر تیار ہو گئی۔ اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں بورڈ میں شرکت منظور فرمائی۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط بنام سید مصباح الدین عبدالرحمن صاحب میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ (عہدہ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلامیہ) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مگر میں نے بعض شروط رکھے تھے۔ وہ اب پورے ہو رہے ہیں یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے۔ تو میں نے ۲ راگست کو قبول کر لیا۔ تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جا سکے۔ گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے"۔ (معارف سلیمان نمبر ص ۴۲)

سیکولر سٹیٹ

اگرچہ عوام کی اشک شوئی کے لیے دستوری سفارشات مرتب کرنے کی از سرِ نو کوشش شروع ہو گئی تھی اور سفارشات کو مرتب کرنے والے بورڈ کی صدارت سید صاحب کو سونپ دی گئی تھی۔ جن پر قریباً ہر فرقہ اور طبقہ کو اعتماد تھا۔ مگر پاکستان اپنے مخلص بانیوں قائد اعظم محمد علی جناح شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور شہید ملت نوابزادہ لیاقت علی خان سے محروم ہونے کے بعد بحیثیت مجموعی ایسے طبقہ کے ہاتھوں پھنس کر رہ گیا تھا۔ جس کو ان مقاصد

سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی جن کی خاطر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اسے پاکستان کے مفاد سے اپنا مفاد زیادہ عزیز تھا اور وہ سیاسی جوڑ توڑ اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر میں شب و روز غلطاں و پیچاں تھا۔ اس نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ شاید زمام اقتدار ہمیشہ اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اس لیے وہ تدوین آئین کے مسلہ کو اپنی ذاتی عینک سے دیکھ رہا تھا۔ قومی نقطۂ نظر سے نہیں۔ اس لیے پھر وہی آواز بلند ہوئی جسے قرار داد مقاصد نے دبا دیا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر سٹیٹ ہوگی۔ چونکہ یہ آواز حلقۂ اقتدار کے دلی ارادوں کی غماز تھی۔ اس لیے ملک کے موقر جرائد نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

نظام اسلام کانفرنس علماء و مشائخ نے اس آواز کے خلاف پر زور احتجاج کرنے اور ارباب حکومت کو اپنا فرض جتلانے کے لیے ۱۴-۱۵ ار نومبر ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں زیر صدارت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی ناظم اعلیٰ مرکزی جمیعۃ علماء اسلام نظام کانفرنس منعقد کی۔ جس میں بقول مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، پچاس ہزار علماء و مشائخ اور ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے شرکت کی اور اس میں کھلے لفظوں میں اربابِ حکومت کو بتلا دیا گیا کہ :-

۱۔ پاکستان کے دستور کا کوئی جزء، کوئی گوشہ اور کوئی دفعہ اگر اسلامی نظام کے خلاف ہوا، تو وہ دستور ہر گز اسلامی نہ کہلائے گا اور

۲۔ کسی ایسے دستور کو ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا۔ جو بنایا تو گیا ہو اسلام کے نام پر لیکن اس میں اسلامی روح کار فرما نہ ہو۔

۳۔ یہ مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے۔ ایک ایسا فیصلہ جس کو منوانے کی خاطر وہ ہر قسم

کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

ایوانِ اقتدار میں زلزلہ

پاکستان کے دیندار طبقہ کے اس متفقہ فیصلہ سے ایوانِ اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ ابھی اس کانفرنس کے اجلاس کا تیسرا دن نہیں گذرا تھا کہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے دعوت نامے اکابر علماء کے نام پہنچے کہ آپ جلد کراچی پہنچیں، تاکہ ۲۲ر نومبر ۱۹۵۲ء کو جو دستور اسمبلی میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس پر غور و خوض کیا جائے۔

وزراء علماء کانفرنس

چنانچہ وزیر اعظم کی دعوتِ خاص پر ۱۹ر نومبر ۱۹۵۲ء کو:

۱۔ مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ

۲۔ مولانا محمد ادریس صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ، لاہور

۳۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار

۴۔ مولانا اطہر علی صاحب مجاز حضرت تھانویؒ۔ مشرقی پاکستان۔

۵۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی۔ کراچی

۶۔ مولانا شمس الحق صاحب فریدپوری مہتمم اشرف العلوم ڈھاکہ۔

۷۔ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مہتمم خیر المدارس ملتان۔

۸۔ مولانا عبد الحق صاحب اکوڑہ خٹک ضلع پشاور۔

۹۔ مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی صدر جمعیۃ اہل حدیث لاہور۔

۱۰۔ مولانا دین محمد صاحب ناظم جمعیۃ علماء اسلام۔

وزیر اعظم سے ملاقات کی غرض سے وقت مقررہ یعنی ٹھیک نو بجے رات کو ان

کی کوٹھی پر پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کوٹھی کے باہر آکر علماء کرام کا استقبال کیا۔ اندر لے جا کر باعزت طریق سے بٹھلایا۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے مدعوین کا تعارف کرایا۔ اتنے میں مولوی تمیز الدین صاحب صدر دستوریہ، سردار عبدالرب نشتر، دیگر وزراء اور سیکرٹریوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ دوسرے کمرہ میں اجلاس شروع ہوا۔ ایک لائن میں علماء کرام اور دوسری لائن میں پانچ وزراء اور ایک سیکرٹری بیٹھ گئے۔ وزیر اعظم صاحب نے کتاب و سنت کے موافق دستور مرتب کرنے کے سلسلہ میں کچھ عملی اشکالات پیش کر کے ان کا حل طلب کیا، جن کی وضاحت سردار عبدالرب نشتر اور مولانا تمیز الدین حسب ضرورت فرماتے رہے اور علماء کرام ان کا تحقیقی جواب پیش کرتے رہے اور انہوں نے ہر معاملہ میں وزراء کی پوری تسلی کرادی اور ان کے ملی و سیاسی فوائد بھی تبلادیئے جس سے وزراء بہت متاثر ہوئے۔ اشکالات کا جواب دینے کے بعد علماء کرام نے کھلے لفظوں میں وزراء کو تبلا دیا کہ اگر انہوں نے دستور اسلامی سے ایک انچ بھی انحراف کیا، تو پاکستان میں ایک ایسا طوفان آئے گا کہ جس میں آپ کے اقتدار کی کرسیوں کا خاتمہ یقینی ہے۔ خواجہ صاحب نے یقین دلایا کہ آپ حضرات بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ عوام کی خواہش کے مطابق ہی دستور بنایا جائے گا۔ اور علماء کرام کے پیش کردہ بائیس نکات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ چنانچہ یہ کانفرنس رات کے دو بجے ختم ہوئی اس دوران میں مدعوین کی چاء وغیرہ سے خاطر تواضع کی گئی۔

اسلامی دستور

۱۰ اس کانفرنس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس دستوری رپورٹ کو ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کے اجلاس دستوریہ میں پیش کرنے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اسے ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء پر ملتوی کر دیا گیا تاکہ اسے عوام و علماء کے مطالبات کے زیادہ قریب

لایا جا سکے۔ چنانچہ ۲۲ر دسمبر کو مجلس دستور ساز میں جو دستور پیش کیا گیا وہ ۷۵ فی صدی اسلامی تھا۔

علماء کا غور و خوض اس دستور کے پیش ہونے پر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ڈھاکہ سے اعلان جاری کیا کہ اس دستور پر علماء فرداً فرداً اپنی رائے ظاہر نہ کریں بلکہ وہی ۳۱ علماء جو دستور اسلامی کا بائیس نکاتی خاکہ پیش کر چکے ہیں، پھر کراچی میں جمع ہو کر اس پر غور کر کے اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ بفضلہ تعالیٰ علماء کرام نے اس موقع پر بھی پورے اتفاق و اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے اس دستور پر اپنی انفرادی رائے کے اظہار سے گریز کیا اور ۱۱ر جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پھر ان علماء کرام کا اجتماع ہوا، جنہوں نے ۲۲ نکاتی دستوری خاکہ مرتب کیا تھا۔ اب کے ۳۱ کی بجائے ۳۳ علماء جمع ہوئے۔ یعنی مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی، مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹیؒ، مولانا دین محمد نائب صدر جمعیۃ علماء اسلام کا اضافہ ہوا اور مولانا بدر العالم صاحب مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ ۱۱ر جنوری سے ۱۸ر جنوری ۱۹۵۳ء تک نو اجلاس مختلف اوقات میں ان حضرات کی زیر صدارت منعقد ہوئے:۔

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

۲۔ حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسری۔

۳۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی۔

۴۔ حضرت مولانا ابو الحسنات صاحب۔

۵۔ حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب۔

اس اجتماع میں علماء کرام نے چند اہم ترمیمات کے ساتھ نئے دستور کی تائید کر دی۔ واضح رہے کہ اس موقع پر بھی ان حضرات نے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی تجاویز استفادہ کے لیے حکومت سے طلب کیں۔ لیکن عمدہ دستور یہ نے اس اجتماع کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا پسند نہ کیا۔

علماء کی بالغ نظری

اس دستور میں اس بات کی تصدیق کے لیے کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے موافق ہے یا نہیں، علماء کا ایک بورڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ چونکہ اس سے بہت سی خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے علماء کرام نے ایسے بورڈ کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:۔

"پیراگراف ۴-۵-۶ اور ۸ میں قرآن اور سنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کے لیے علماء کے ایک بورڈ کے قیام کی جو صورت پیش کی گئی ہے، وہ نہ کسی لحاظ سے معقول ہے اور نہ اس طرح قانون سازی کو روکنے کے لیے مؤثر ہو سکتی ہے۔ البتہ اس سے بہت سی نئی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح دوسرے قوانین کے معاملہ میں حدود دستور سے متجاوز قانون سازی کی روک تھام کے لیے تعبیر دستور کے اختیارات سپریم کورٹ کے سپرد کیے گئے ہیں، اسی طرح پیراگراف ۴ کے معاملہ کو بھی سپریم کورٹ ہی پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔"

(متفقہ تبصرہ و ترمیمات ص۴ و ص۵)

اس طرح علماء کرام نے ارباب اقتدار کی ایک ایسی تجویز کو پائے استحقار سے ٹھکرا

دیا، جس سے بظاہر علماء کے وقار کو ہی فائدہ پہنچتا تھا، مگر بباطن ایسی خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا، جن کا مشاہدہ شاہانِ عثمانیہ کے دورِ حکومت میں ہو چکا تھا۔

راست اقدام

آئین سازی کا مسئلہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک جسے پہلے پہلے مجلس احرار چلا رہی تھی اوائل ۱۹۵۲ء میں آل مسلم پارٹیز کنونشن نے سنبھال لی۔ جس میں ہر فرقہ کے علماء اور مودودی صاحب شریک تھے۔ مودودی صاحب کا بیان ہے کہ:۔

"میں شروع سے ہی ختم نبوت کی الگ تحریک چلانے کے خلاف تھا اور میں نے یہ رائے دی تھی کہ الگ تحریک چلانی کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس تحریک کو اسلامی دستور میں مدغم کر دیا جائے۔" (تسنیم ۲۱ر جولائی ۱۹۵۵ء)

مگر مودودی صاحب کو تحریک کا رُخ بدلنے میں کامیابی نہ ہوئی اور ۱۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو کنونشن نے کراچی میں راست اقدام کی تحریک منظور کر لی۔ چونکہ مودودی صاحب حال ہی میں عوام کے ہاتھوں صوبائی الیکشن میں بُری طرح مار کھا چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اور اپنی جماعت کی ساکھ قائم رکھنے اور عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے راست اقدام میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیا۔ جو تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے مطابق حکومت پاکستان کے خلاف بغاوت کرنے سے کم نہ تھا۔

انکشافِ حقیقت

کنونشن کے ابتدائی اجلاسوں میں شرکت کرنے کے بعد ہی مودودی صاحب اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ:۔

"احرار کے سامنے اصل سوال تحفظ ختم نبوت کا نہیں ہے بلکہ نام اور سہرے کا ہے اور یہ لوگ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنی اغراض کے لیے جوئے کے داؤ

پر لگا دینا چاہتے ہیں - دوسرے یہ کہ رات کو بالاتفاق ایک قرار داد طے کرنے کے بعد چند آدمیوں نے الگ بیٹھ کر ساز باز کیا ہے اور ایک دوسرا ریزولیوشن بطور خود لکھ لائے ہیں - جو بہر حال کنونشن کی مقرر کردہ سب جیکٹس کمیٹی کا مرتب کیا ہوا نہیں ہے - میں نے محسوس کیا کہ جو کام اس نیت اور ان طریقوں سے کیا جائے، اس میں کبھی خیر نہیں ہو سکتی اور اپنی اغراض کے لیے خدا اور رسولؐ کے نام سے کھیلنے والے، جو مسلمانوں کے سروں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کریں، اللہ کی تائید سے کبھی سرفراز نہیں ہو سکتے - اسی خیال کے ماتحت میں نے صدر مجلس مولانا ابوالحسنات صاحب کو چٹ لکھ کر دی کہ انصاری صاحب کے بعد مجھے تقریر کی اجازت دی جائے - لیکن اس کے بعد دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اگر میں اس سے اس وقت علیحدہ ہو جاؤں تو صرف اپنا ہی دامن اس فتنے سے بچا لے جاؤں گا - اسلام اور مسلمانوں کو جس خطرے میں یہ لوگ مبتلا کرنا چاہتے ہیں - اس کو روکنا اس طریقہ سے ممکن نہ ہو گا - اس بنا پر میں نے کنونشن سے علیحدگی کا ارادہ ترک کر دیا"۔

(تسنیم ۲ر جولائی ۱۹۵۵ء و صدق جدید ۱۲ر اگست ۱۹۵۵ء)

دیانت یا خیانت

مگر مودودی صاحب یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود کہ:-

الف: یہ تحریک ایک فتنہ ہے -

ب: اس تحریک کو چلانے والوں کی نیت ٹھیک نہیں -

ج: اس نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے کبھی خیر کی امید نہیں

ہو سکتی۔

د: یہ اپنی اغراض کے لیے مسلمانوں کے جان و مال کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔

ہ: بلکہ خدا اور رسولؐ کے نام پر مسلمانوں کے سروں کو شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

راست اقدام میں بمعہ اپنی جماعت کے عملاً شریک رہے۔ ان کی جماعت کے ذمہ دار افراد نے ذمہ دار احکام کی موجودگی میں راست اقدام کی تائید کی۔ مسٹر محمد باقر امیر جماعتِ اسلامی ملتان کی گرفتاری ان کی ایسی تائیدی تقریر کی بناء پر ہوئی، جو انہوں نے ڈپٹی کمشنر ملتان کے روبرو ایک وفد کی موجودگی میں کی۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کے دیگر افراد بھی راست اقدام میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ ان کی جماعت مختلف شہروں میں گرفتار ہونے والے اسلامی جماعت کے کارکنوں کے پسماندگان کی امداد کے لیے، راست اقدام کی مجلسِ عمل کے فنڈ سے امدادی رقوم وصول کرتی رہی اور یہ سب کچھ "اسلام اور مسلمانوں کو خطرے" سے نکالنے کے نام پر ہوتا رہا۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ جب مودودی صاحب پر حقیقتِ حال واضح ہو گئی تھی، وہ دیانت داری کے ساتھ اس تحریک سے الگ تھلگ رہتے۔ مگر دفار کے خطرہ نے انہیں اس تحریک سے الگ نہ ہونے دیا۔

راست اقدام سے علیحدگی

بخلاف اس کے جب مودودی صاحب کے بیان کردہ واقعات کی علماءِ اشرفیہ کو تصدیق ہو گئی، تو انہوں نے اس اجلاس میں شرکت کرنے کے باوجود، جس میں راست اقدام کا ریزولیوشن منظور ہوا تھا۔ راست اقدام میں عملی حصہ لینے سے

صاف انکار کر دیا اور جمیعۃ علماء اسلام کے صدر علامہ سید سلیمان ندوی نے مجلس عاملہ کا اجلاس بلا کر راست اقدام سے الگ رہنے کی باقاعدہ قرارداد منظور کی - چنانچہ سید صاحب کے مسترشد غلام محمد صاحب ایم اے عثمانیہ "سید سلیمان ندوی کے پاکستان میں تین سال" کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ :-

> "علامہ ان دنوں آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کی صدارت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے جا رہے تھے - روانگی سے پہلے آپ نے اپنی جمیعت کے عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور بکمال فراست یہ قرارداد منظور کروائی کہ راست اقدام سے جمیعۃ علماء اسلام قطعاً الگ رہے گی - چنانچہ ایسا ہی ہوا "
>
> (ماہنامہ "ریاض" کراچی سید سلیمان نمبر مارچ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۳۵)

مسئلہ ختم نبوت چونکہ مسلمانوں کے دین و ایمان سے تعلق رکھتا ہے - اس لیے علماء اشرفیہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اس کی ابتدائی کارروائیوں میں شریک رہے - لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ یہ مخلصانہ تحریک بعض ارباب غرض کی خفیہ ریشہ دوانیوں سے سیاسیانہ حیثیت اختیار کر گئی ہے - تو وہ اس سے فی الفور الگ ہو گئے - کیونکہ انہیں عوام میں مقبولیت حاصل کرنے یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی - اور انسان ایسی جرأت و دیانت اسی وقت ہی دکھا سکتا ہے، جب اس کی راہ میں ذاتی اغراض نہ ہوں -

مارشل لاء راست اقدام کا فوری نتیجہ فسادات کی شکل میں رونما ہوا - جس کی وجہ سے لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا - جس میں مودودی صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے - جنہیں ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو ایک فوجی عدالت نے

پھانسی کی سزا دی، جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی۔

اس کے بعد جماعتِ اسلامی مودودی صاحب کی رہائی کی کوششوں میں مصروف ہو گئی۔ اس نے اربابِ اختیار سے ان کی رہائی کا مطالبہ کرتے وقت یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے راست اقدام کی مہم میں کوئی عملی حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ جیسا کہ جماعت کے پمفلٹ "مولانا مودودی کی سزائے موت" کے تیسرے پیراگراف سے ظاہر ہے۔ جس میں درج ہے کہ:۔

"ڈائریکٹ ایکشن اور بیرونی طاقتوں سے جماعت کا تعلق جوڑنے کی اس ناپاک کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اپریل کے آخر میں مولانا مودودی کا کورٹ مارشل کرنے کا فیصلہ کیا گیا"۔

حالانکہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت نہ صرف راست اقدام میں شریک رہی بلکہ اس کی مجلسِ عمل سے بعض مقامات پر جماعتِ اسلامی اپنے کارکنوں کا حق الخدمت بھی وصول کرتی رہی۔

سیّد صاحب کی رحلت

۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو تعلیمات اسلامی بورڈ کے صدرِ محترم علامۃ العصر سید سلیمان ندوی وفات پا گئے۔ جس سے عالمِ اسلام ایک یگانۂ روزگار عالم بے بدل مؤرخ، ممتاز مصنف اور علومِ اسلامیہ کے ماہر سے محروم ہو گیا اور استحکامِ پاکستان کی مخلصانہ جد و جہد کرنے والوں کی صف میں مزید خلا پیدا ہو گیا اور تمام تر ذمہ داریاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ناتواں کندھوں پر آ پڑیں۔

مقصدِ پاکستان

معمارِ پاکستان نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے

ارباب اختیار و اقتدار کے ایک اہم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ان پر ایک دفعہ پھر یہ امر واضح کر دیا تھا کہ پاکستان اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا ہے کہ :۔

"ہم ایک ایسا وطن حاصل کریں جس میں ہم اپنی عقل و دانش اور ثقافتی اقدار کے مطابق ترقی کر سکیں اور جہاں سماجی اور معاشرتی انصاف کے اسلامی اصول بلا روک ٹوک پنپ سکیں۔"

یہی بات انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی کے شاہی دربار میں دہرائی کہ :۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہماری نجات پیغمبر اسلامؐ کے قائم کردہ سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں ہی مضمر ہے۔ آئیے ! ہم اپنی جمہوریت کی عمارت حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں کی بنیادوں پر استوار کریں۔

ناپاک مساعی

بدقسمتی سے ہمارے ارباب اختیار و اقتدار کی اکثریت چونکہ مغرب زدہ بلکہ پرویز زدہ تھی اور مفاد پرست، متضاد عناصر پر مشتمل تھی' اس لیے وہ اسلامی اصولوں کے احیاء کو پاکستان کے لیے نہیں' اپنے لیے موت کے پروانہ پر دستخط کرنے کے مترادف سمجھتی تھی۔ بظاہر تو وہ قومی اتحاد' ملّی استحکام اور ملکی سلامتی کا دم بھرتی تھی، مگر بباطن پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو اکھاڑنے اور عملاً قائداعظم کے اصول و ہدایت کے نقوش مٹانے میں مصروف تھی۔ جن کی کوششوں سے یہ برسر اقتدار آئی تھی۔ گویا یہ معمار پاکستان کی خدمات و احسانات کا پہلا بدلہ تھا' جو ارباب اقتدار ان کی خدمت میں پیش کر رہے تھے اور جس کی تفصیل قلمبند کرنے کی قلم میں ہمّت نہیں۔

ارباب اقتدار کی ان ناپاک مساعی کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ سات سال تک

تو پاکستان کے دستور بننے کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب کہ قریباً ۷ سال کے عرصہ میں ہندوستان اپنا آئین مکمل کر چکا تھا اور جب قدرت نے اپنے مخلص بندے کی خواہشات کی تکمیل خود انہی محسن کشوں کے ہاتھ سے کرا دی یعنی اسلامی آئین قریباً قریباً تیار ہو گیا، تو وہ اس کرامت پر حیران و ششدر رہ گئے کہ جس موت سے وہ ڈر رہے تھے وہ اب ان کے سامنے تھی۔ اس لیے انہوں نے اس سے بچنے کے لیے ایک دوسری چال چلی۔

دستوریہ کی معطلی

۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اقتدار پرست گروہ نے دستور ساز اسمبلی سے پروڈا کا وہ قانون منسوخ کرا لیا، جس کی رُو سے نااہلوں کی گردن ناپی جاتی تھی۔ ۲۱ ستمبر کو انہوں نے گورنر جنرل کے اختیارات کو محدود کرنے کا قانون پاس کرا لیا، جس نے نئے آئین کی منظوری دینی تھی اور غضب یہ کہ دستور ساز اسمبلی میں یکے بعد دیگرے بعجلت تمام ایسے قانون پیش اور پاس ہو رہے تھے اور وزیر قانون کو ان کا علم تک نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ حیران و پریشان تھے۔ غرضیکہ جب ارباب اختیار اوچھے قسم کی جنگِ اقتدار پر اتر آئے اور انہوں نے ملک کی سالمیت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا، تو مجبوراً جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان نے ملک میں ہنگامی صورت حالات کا اعلان کرتے ہوئے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مجلس دستور ساز کو توڑ کر اقوام عالم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا اور آج تک اسلامی آئین کی ترتیب و تشکیل کے لیے جس قدر کوششیں ہوتی رہی تھیں، ان پر پانی پھر گیا اور اس طرح وہ طبقہ جو اسلامی آئین کے نفاذ کا مخالف تھا، اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ کامیاب و کامران

ہوگیا۔

علما کی مخالفت

مئی ۱۹۵۵ء میں مودودی صاحب مارشل لائی قید سے رہا ہوکر آگئے اور اپنے ساتھ علماء کرام کے خلاف صف آراء ہونے کا پروگرام لائے۔ جنہیں وہ اپنی راہ کا سنگ گراں سمجھتے تھے۔ مودودی صاحب جس وقت تک جیل میں تھے، دین پسند جماعتوں میں اتحاد و اتفاق کی فضا ہموار ہو رہی تھی، اور جب وہ باہر آئے، تو انہوں نے مسٹر غلام محمد پرویز مدیر "طلوع اسلام" اور خلیفہ عبدالحکیم مصنف "اقبال اور ملّا" سے "اینٹی ملّا فرنٹ" کا چارج خود لے لیا۔ اور علماء کرام کے خلاف جو باتیں شوخی اور بیباکی کے ساتھ وہ آج تک نہیں کہہ سکے تھے۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے پوری جرأت و دلیری کے ساتھ کہنی شروع کر دیں۔

مودودی صاحب اپنی رہائی کے بعد ۷ ارجون کو سرگودہا تشریف لے گئے۔ اسلامی جماعت کے اخبارات کے بیان کے مطابق وہاں کے معززین نے مودودی صاحب کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے علماء کرام کی تہذیب، تحریر، تقریر، تمدن اور معاشرت پر حملہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> "اس ملک میں اس وقت دو طبقے ہیں۔ ایک طرف قدامت پسند طبقہ ہے جس کا پورا ماحول قدامت پسندی کا ہے۔ اس طبقہ کی طرف سے جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ بھی پرانے طرز کی ہے اور ان کا طرز تحریر و تقریر اور تہذیب و تمدن، غرض ہر چیز قدیم طرز کی ہے۔ یہ لوگ دنیا کے موجودہ حالات تقاضوں اور عوام سے بہت حد تک لاتعلق ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کے پاس دین کا علم

موجود ہے۔ یہ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے، اُن کے افعالِ حسنہ اور قرآنِ مجید سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ کس صدی میں مسلمانوں کی روایات کیا تھیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود انہیں اس بات کا علم کم ہے کہ اس وقت کے حالات اور ان کے تقاضے کیا ہیں"۔

(اعتصام ۲۲ر جولائی ۱۹۵۵ء)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جس فرقہ یا طبقہ کو جس مفکّر اور مدبّر، رہبر یا پیغامبر سے تعلق، محبت اور انس ہوتی ہے۔ وہ اسی کا ہی اتباع کرتا ہے۔ مثلاً نو تعلیم یافتہ طبقہ کی نظر میں مغربی تہذیب و تمدّن پسندیدہ ہے۔ اسی لیے وہ اسی کو اپنائے ہوئے ہے۔ علمائے کرام، مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعالِ حسنہ، قرآن مجید کی تعلیمات اور سلف صالحین کی روایات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے ان کا عمل ان کے علم کے عین مطابق تھا۔ انہیں وہی تہذیب و تمدّن پسند تھا، جو خدا کے رسولؐ اور اس کے تبعین کو پسند تھا اور جو جماعت اسلامی کے امیر کو ناپسند ہے۔

علمائے کرام کے خلاف حقارت و نفرت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کے بعد مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی اہمیّت جتلاتے ہوئے فرمایا کہ:-

"اسی طرح قدیم طرز کا عالم یہ کہتا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام جاری ہونا چاہیے حالانکہ اسے بہت کم یہ معلوم ہے کہ آج کے دَور کا عدالتی نظام کس طرز کا ہے اور کیسے چلتا ہے۔ اگر شامی اور ہدایہ موجودہ عدالتی نظام میں جوں کی توں رکھ دی جائے اور اس پر اصرار کیا جائے کہ اسے بعینہٖ نافذ کیا

جائے تو سارا نظامِ عدالت ہی معطل ہو جائے۔ جب جدید فکر کا انسان اسے دیکھتا ہے، تو کہہ اٹھتا ہے۔ کہ اسلام ایک فرسودہ نظام ہے اور اس کے نفاذ سے پورا ملکی نظام ہی ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جماعتِ اسلامی جہاں اسلامی نظام پیش کرتی ہے، وہاں پوری تفصیلات کے ساتھ اسلام کے اصولوں کو موجودہ نظام ہائے عدالت و سیاست پر منطبق کر کے قابلِ عمل شکل میں پیش کرتی ہے۔" (بحوالہ صدر)

مودودی صاحب کی تقریر کا یہ ٹکڑا ان کی لسانی اور لفاظی کا پورا شاہکار ہے۔ جماعت علماء نے کبھی یہ نہیں کہا کہ شامی و ہدایہ کو بعینہٖ رائج کر دیا جائے جس کی تائید خود مودودی صاحب کے اس فقرہ سے ہوتی ہے کہ:۔

"اگر شامی و ہدایہ موجودہ عدالتی نظام میں جوں کی توں رکھ دی جائے اور اس پر اصرار کیا جائے کہ اسے بعینہٖ نافذ کیا جائے تو .... الخ"

اور اس فقرہ سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ علماء نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔ یہ صرف مودودی صاحب کی قیاس آرائی اور تخیل پردازی ہے۔ جس پر وہ ہوائی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔ تعمیر پاکستان اور تدوین آئین کے سلسلہ میں اس وقت تک جس قدر تفصیلات آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں، وہ اس بات کی شاہد عدل ہیں کہ جس طرح مودودی صاحب علماء کرام کو

۱۔ عوام سے بہت حد تک لاتعلق۔

۲۔ دُنیا کے موجودہ حالات سے بے بہرہ۔

۳۔ وقت کے تقاضوں سے لاعلم۔

ظاہر کر رہے تھے، فی الواقعہ وہ ایسے نہیں تھے۔ بلکہ ان کی فراست، ان کی بصیرت آنے والے واقعات کو پہلے سے تاڑ لیتی رہی۔ ان کی نظر ہر وقت واقعات کی رفتار پر رہی اور وہ تعمیری جدوجہد میں مصروف رہے۔ انہوں نے دستوری مہم میں جس قدر مطالبات پیش کیے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا کہ جو "اسلام کے فرسودہ نظام" کا مظہر ہو۔ مگر چونکہ مودودی صاحب علماء کرام کو اپنی "مجددیت" کی راہ میں حائل سمجھ رہے تھے۔ اس لیے وہ خود پسندی، انفرادیت پسندی اور تجنب پسندی کے ماتحت ایسا کہنے پر مجبور تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی جماعت کے صحائف بھی علماء کرام کی تحقیر و تذلیل کو اپنا فرض سمجھے ہوئے تھے اور علانیہ علماء کرام کو یوں خطاب کر رہے تھے کہ:۔

"آپ کے فتوے اب پرانی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ آپ کا طرز استدلال زمانے کے ذہن سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آپ کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ آپ وقت کے حکمرانوں کے ہاتھوں میں بلا تکلف کھیل جاتے ہیں اور بڑی آسانی سے آپ کی قوتِ تقریر و تحریر اور آپ کے قلمدانِ فتویٰ نگاری کو ہر قسم کی طاقتیں خرید سکتی ہیں۔"

(چراغ راہ ماہ جولائی ۵۵ء)

یہ اقتباس محتاجِ تبصرہ نہیں۔ تعمیر پاکستان اور تدوین آئین کی ساری تاریخ اس وقت آپ کے سامنے ہے اور آپ بآسانی موازنہ اور فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ اس دوران میں کس جماعت کو کس نے خریدا اور کس کے فتوے کس کے کام آئے ؎

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں تابِ سخن بھی ہے

تشویشناک خبریں

۱۲؍ جون ۱۹۵۵ء کو نئی مجلس دستور ساز معرضِ وجود میں آ گئی ۔ عام طور پر خیال یہ تھا کہ سابق دستوریہ کے منظور کردہ دستور میں اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے جو خامیاں رہ گئی تھیں اور جو خلا باقی تھا، نئی دستوریہ ان خامیوں کو دور اور اس خلا کو پُر کر دے گی ۔ مگر اربابِ غرض اس کوشش میں تھے کہ پہلے سے پاس شدہ اُن دفعات کو بھی یا اُن میں سے بعض کو حذف کرا دیا جائے، جن سے اسلامی یا جمہوری اصولوں کی تائید ہوتی تھی ۔ بلکہ بعض دشمنانِ اسلام و پاکستان نے تو اس امر کی کوشش شروع کر رکھی تھی کہ :۔

۱۔ مملکت کے نام "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" سے لفظ "اسلامیہ" خارج کر دیا جائے ۔

۲۔ دو قومی نظریہ کو ختم کر کے ملک میں مخلوط انتخاب کا طریق رائج کیا جائے ۔

۳۔ مملکت کے سربراہ کا مسلمان ہونا لازمی قرار نہ دیا جائے اور

۴۔ مشرقی پاکستان کو کامل خود مختیاری دی جائے ۔

یہاں تک کہ بعض عاقبت نااندیش حلقوں کی طرف سے اس قسم کی دھمکی بھی دی جا رہی تھی کہ اگر ہمارے مطالبات منظور نہ کئے گئے، تو ہم ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیں گے ۔

یہ تمام آوازیں مشرقی پاکستان سے اٹھ رہی تھیں، جہاں ابھی وہ ہندو اور اُن کا روپیہ بدستور کام کر رہا تھا ۔ جن کی بھارت ماتا کے پاکستان نے ٹکڑے کر دیئے تھے اور جن کو پھر سے جوڑنے کے لیے وہ ہر قسم کی خفیہ جد و جہد میں مصروف تھے ۔ بالفاظ دیگر اب ہندوؤں کے مطالبات مسلمانوں کی زبان سے پیش ہو رہے تھے اور ان مطالبات

کو منوانے کے لیے مغربی پاکستان پر پورا دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ جس پر سے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے اپنے یکم فروری ۱۹۵۶ء کے اداریہ میں عوامی لیگ اور متحدہ محاذ کے مبینہ اتحاد کی خبروں پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں پردہ اٹھایا کہ:۔

"مطلوبہ اتحاد کی غرض و غایت فقط یہ ہے کہ عوامی لیگ اور متحدہ محاذ مل جائیں اور دونوں مل کر مغربی پاکستان کے نمائندوں کے خلاف متحدہ محاذ پیش کر کے اپنے مطالبات منوائیں تاکہ مغربی پاکستان کے نمائندے سرتابی کی جرأت نہ کر سکیں اور ان مطالبات کی نوعیت کیا ہے، مولانا بھاشانی کے بیان کے مطابق:۔ مشتے نمونہ از خروارے

"مشرقی پاکستان کیلئے کامل خود مختیاری اور مخلوط انتخاب"

دوسری طرف جماعتِ اسلامی کے امیر امریکہ اور برطانیہ کو اس امر کی دعوت دینے کا پروگرام مرتب کر رہے تھے کہ وہ اسلامی ملکوں کی حکومتوں کے ساتھ خارجی معاملات میں اشتراک عمل کرنے کی بجائے دوسرے عناصر کو ان ملکوں میں برسرِ اقتدار آنے کے لیے مدد دیں اور انہیں حکمران بنا کر ان کے ساتھ دوستی اور اتحادِ عمل کے تعلقات استوار کریں اور ان دولِ فرنگ سے حکومتِ پاکستان کے مقابلہ میں جماعتِ اسلامی کی مدد کرنے کے لیے مودودی صاحب اپنے سالانہ اجتماع میں علانیہ فرما رہے تھے کہ:۔

"ہمارا کام اب صرف یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا تجزیہ کر کے اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر دیں۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا مغربی طاقتوں کا اپنا کام ہوگا کہ وہ اپنی موجودہ روش کو برقرار رکھیں اور مسلمانوں کی امنگوں کو دبانے اور مسلم ممالک کے غیر نمائندہ حکمرانوں سے جوڑ توڑ کرنے کا کام کرتی رہیں یا مسلمان عوام

کی قومی اور دینی امنگوں کو دبانے سے باز آجائیں اور ان کا دلی تعاون حاصل کریں - اگر یہ لوگ (امریکی اور برطانوی) اسی طرح ان آزاد ممالک کی غیر نمائندہ ٹولیوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرتے رہے، تو انہیں کبھی یہ توقع نہیں ہونی چاہئیے کہ ان ممالک کے عوام ان کے ساتھ تعاون کریں گے "۔

(نوائے وقت "لاہور، مورخہ ۲۶ ر نومبر ۱۹۵۵ء)

اور اس طرح دشمنانِ اسلام کو پھر سے اس اسلامی مملکت میں خفیہ ریشہ دوانیوں کا جال پھیلانے کی دعوت دی جا رہی تھی۔

اور " سٹار " کی اطلاع کے مطابق مغربی پاکستان کی سی-آئی-ڈی پولیس جماعت اسلامی کے بعض عہدہ داروں کے خلاف مقدمہ قائم کر کے اس کے دفاتر پہ اس الزام میں چھاپے مار رہی تھی اور بعض فوٹو، چارٹ، نقشے، رجسٹر و خط و کتابت کے فائل وغیرہ پر قبضہ کر رہی تھی کہ :-

" اس نے پاکستان کے باہر ایسا لٹریچر اور تصاویر بھیجیں، جن میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین کے حامیوں کو پھانسی دی جا رہی ہے - یا جیلوں میں ڈالا جا رہا ہے "

(نوائے وقت ۳ ر جنوری ۱۹۵۶ء)

اور گورنر جنرل سکندر مرزا صاحب تخریب پسند عناصر کو متنبہ کر رہے تھے کہ :-

" پاکستان سے علیحدگی کی باتیں کرنا کھلی غداری ہے اور اس کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے، جس کی وفاداریاں غیر ملکوں کے ساتھ ہوں اور بدقسمتی سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دونوں جگہ ایسے افراد موجود ہیں - ہمارے ملک میں بعض جماعتیں اس حد تک پست ذہنیت اختیار کر چکی ہیں کہ وہ غیر ملکی

اداروں کو اپنے ہی ملک کے خلاف کارٹون اور دوسرا مواد بھیجنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ایسی جماعتیں یا افراد اپنے سوا کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔"

(نوائے وقت ۔ لاہور، ۸ ۲ جنوری ۱۹۵۶ء)

اور ملک کی اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے خاتونِ پاکستان محترمہ فاطمہ جناح ملک کے ذمہ دار اخبارات سے سازشی لیڈروں کو بے نقاب کرنے کی اپیل کر رہی تھیں اور فرما رہی تھیں کہ :۔

"بسا اوقات پاکستان کا مفاد اس امر کا متقضی ہوتا ہے کہ سازشوں کو بے نقاب کیا جائے اور سازشی قیادت کا تار و پود بکھیر دیا جائے"۔

"اگر اخبارات پوری جراٴت کے ساتھ حق گوئی اپنا شعار بنا لیں۔ اگر وہ اربابِ اختیار کی خوشامد سے دست کش ہو جائیں۔ سماج دشمن عناصر کی پشت پناہی نہ کریں اور ملک کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی مفاد کے منافی سرگرمیوں پر ملک کی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی بے نقاب کرنے پر ہمہ وقت تیار رہیں، تو اب بھی ایسا ماحول پیدا ہو سکتا ہے، جس میں صحت مند اور مضبوط پریس کی تعمیر اس ملک کے رہنے والوں اور آئندہ نسلوں کے لیے باعثِ صد افتخار ہو گی"۔ (نوائے وقت لاہور[۳۰۴])

غرضیکہ یہ وہ حالات تھے، جن سے ملک دوچار تھا اور یہ وہ ماحول تھا، جس میں نیا آئین مرتب ہونے والا تھا۔

علماء کا میمورنڈم

ایسے وقت میں جب کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتیں جنگِ اقتدار اور آپس کی مناقشت میں مصروف تھیں

علماء ربانی کی مخلص جماعت جس کا نہ نظم تھا اور جس کے پاس نہ فنڈ تھا۔ ملک کے آئین کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کے مطابق منظور کرانے کے لیے از حد فکر مند تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی ہدایت کے مطابق مرکزی جمعیۃ کے ایک وفد نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نائب صدر کی زیر قیادت ممبران دستور یہ پاکستان اور مرکزی وزراء کی خدمت میں ایک میمورنڈم (انگریزی میں) پیش کیا۔ جس میں مطالبہ کیا گیا کہ :۔

"ہمارا دستور قرار داد مقاصد کے (جسے حسب سابق بطور تمہید دستور کے درج کیا جانا چاہیے) مقتضیات کے عین مطابق مرتب کیا جائے۔ اس میں سابقہ دستور یہ کی منظور کردہ دفعات نمبر ۲۔۴۔۵۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۱۔ ۱۲ (جہاں تک مملکت کے نام کا تعلق ہے) و نمبر ۱۵ (جہاں تک صدر مملکت کے مذہب کا تعلق ہے) ۹۸، ۱۲۷ (ضمیمہ ۱) کو لازماً شامل کیا جائے اور اجتماع علماء منعقدہ کراچی ۱۹۵۳ء کی متفقہ تجاویز و سفارشات (ضمیمہ ۲) کی روشنی میں دیگر اسلامی اور جمہوری دفعات شامل کی جائیں۔ خصوصاً حسب ذیل امور کا التزام ضرور کیا جائے :۔

۱۔ قانون سازی کے لیے قرآن و سنت کو ماخذ اصلی قرار دیا جائے۔

۲۔ سابقہ دستور یہ کی منظور کردہ دفعہ ۴ کے تحت فقرہ شرطیہ درج کیا جاوے جس کا مفہوم یہ ہو کہ مالی مسائل پر دفعہ ۴ کا اطلاق اس وقت ہوگا جب وفاقی اسمبلی اس باب میں قرار داد کے ذریعہ طے کرے اور وہ قرار داد ایک ایسے کمشن کی سفارشات کے مطابق ہو، جو ماہرین علوم اسلامیہ اور ماہرین

علوم مالیہ و اقتصادیہ پر مشتمل ہو اور جس کا تقرر منظوری دستور سے چھ ماہ کے اندر اندر کر دیا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دو سال کی مدت میں ان اقدامات اور تدریجی منازل کی بابت اپنی مکمل سفارشات پیش کر دے جو موجودہ مالی اقتصادی نظام کو بدل کر اسلامی احکام و مقتضیات کے مطابق مالی نظام رائج کرنے کے لیے درکار ہوں۔

۳۔ وفاقی اسمبلی نیز واحدجاتی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ایسے کمشن کے کنٹرول اور مکمل اختیار میں ہونا چاہئیں، جو وفاقی عدالت عدلیہ یا متعلقہ واحدجاتی ہائیکورٹ کے مستقل ججوں پر مشتمل ہو۔ اور ان کو انتخابات سے متعلق تمام مکمل اختیارات حاصل ہوں اور کوئی ایسا قانون وضع نہ کیا جا سکے۔ جو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میں مزاحم ہو سکے۔

۴۔ ہر شہری بلا لحاظ اس کے کہ سوسائٹی میں اس کا کیا مقام ہے، قانون کی نظر میں مساوی ہوگا اور کسی فرد کو قانون کے عمومی ضوابط سے مستثنےٰ اور کسی قسم کی خصوصی مراعات کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔

۵۔ کوئی ایسا قانون نہیں وضع کیا جائے گا۔ نہ برقرار رہ سکے گا جس کے ذریعہ حبس امتناعی یا عام ملکی عدالتوں کے سامنے باضابطہ مقدمے کے بغیر کسی شہری کے لیے کسی اور سزا کا جواز پیدا ہو۔ اِلّا یہ کہ جنگ کے دوران میں کسی ایسے شہری کو جس پر دشمن ملک سے سازش کا الزام ہو، زیر حراست رکھا جا سکتا ہے۔ مگر اسے بھی زیادہ تیس دن کے اندر کسی ہائیکورٹ کے جج کے سامنے بغرض مقدمہ (بشرط ضرورت خفیہ اجلاس میں) مع تمام شواہد کے پیش

کرنا اور اسے اپنی صفائی کا پورا موقع دینا لازمی ہوگا۔

۶۔ پاکستان کے مسلمانوں نیز ہر غیر مسلم جماعت کو جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

۷۔ اگر پارلیمانی عاملہ رکھی جائے تو کسی ایسے شخص کو کابینہ بنانے یا کابینہ میں شامل کئے جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جو وفاقی اسمبلی یا واحد جاتی اسمبلی کا، جیسی بھی صورت ہو منتخب شدہ رکن نہیں ہے۔

۸۔ اگر صدارتی عاملہ ہو تو صدر مملکت کا عام حق رائے دہی بالغاں کے ذریعہ انتخاب ہونا چاہیے اور اس کے انتخابات کے لیے دوگونہ اکثریت لازمی ہونی چاہیے۔ یعنی عام رائے دہندگان کی اکثریت اور مسلم رائے دہندگان کی اکثریت۔

۹۔ پارلیمانی عاملہ کی صورت میں بھی صدر مملکت کا انتخاب حلقہ وفاقی ایوان کے ارکان سے بہت زیادہ وسیع ہونا چاہیے اور اس انتخاب میں بھی دوہری اکثریت کی شرط لازمی ہونی چاہیے۔

۱۰۔ عدلیہ کے مکمل استقلال اور علیحدگی کی ضمانت ہونی چاہیے اور کوئی ایسی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ جس کے ذریعہ عاملہ عدلیہ کو متاثر کر سکے۔"

عملی جدوجہد

دستوری مہم چلانے کے لیے پانچ علماء کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب انصاری۔ مولانا محمد متین صاحب خطیب، مولانا محمد داؤد غزنوی اور علامہ علاؤ الدین صاحب صدیقی پر مشتمل تھی۔ جس وقت ماہ جولائی ۱۹۵۵ء میں دستوریہ کا اجلاس مری میں منعقد ہوا۔ تو مولانا ظفر احمد صاحب انصاری کو وہاں بھیجا گیا تاکہ وہ ممبران دستوریہ سے مل کر اپنے

مطالبات کی اہمیت جتلا اور سمجھا سکیں۔ کراچی کے ممبران وزراء وغیرہ کو ملتے رہے کہ اسی اثناء میں مشرقی پاکستان کے بعض ممبران دستوریہ نے اپنی علالت اور ناموافقتِ آب وہوا کے عذر و بہانہ کے ماتحت وہ اجلاس ملتوی کرا دیا۔

ابتداء میں علماء کرام نے اپنے جو دس بارہ نکات وزراء کرام کے سامنے رکھے ان کے متعلق وزراء نے کہا کہ ان میں سے ایک بات بھی قابلِ عمل نہیں۔ آخر تین روز کی بحث وتمحیص کے بعد وہ بعض امور تسلیم کرنے پر تیار ہو گئے۔

اس کے بعد ایک یونٹ کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اس کی بھی مودودی صاحب نے مخالفت کی جس پر ملک کے ذمہ دار اخبارات نے احتجاج کیا۔ اس عرصہ میں علماء کرام کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مزید جدوجہد کرنے کے لیے وقت مل گیا اور یہ عرصہ انہوں نے ممبران دستوریہ کو ملنے یا انہیں اپنے ہاں مدعو کرنے عوام کو اسلامی آئین کے مطالبہ کے لیے بیدار کرنے، دستوری ہفتے منانے اور ملک کے طول وعرض میں دورے کرنے میں صرف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دستوریہ کے اندر ایک ایسا گروپ پیدا ہو گیا جو اسلامی نظام سے متفق تھا۔

اس زمانہ کی مصروفیات کا اندازہ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے مندرجہ ذیل گرامی نامہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے راقم کے اس خط کے جواب میں لکھا، جس میں کتاب ہذا کے لیے ان سے کچھ معلومات فراہم کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"کرمفرمائے محترم! السلام علیکم!

آپ کے گرامی نامے موصول ہوتے رہے۔ میں جن حالات اور مشاغل میں دِن

بات گذار رہا ہوں - وہ آپ کو معلوم نہیں اور معلوم کرلینے کے لیے تفصیلی خط لکھنے کا وقت نہیں - اس لیے آپ کی ناراضی بجا ہے - اتنا تو آپ کو معلوم ہے کہ یہاں پھر از سر نو دستور کا مسئلہ اسمبلی پارٹیوں میں زیر بحث ہے - میرے جس کام کے متعلق آپ تحریر چاہتے ہیں، اسی کام میں شب و روز اس طرح لگا ہوا ہوں کہ عرض کرنا مشکل ہے - اخبارات میں اپنی کارروائیوں کو اچھالنا عادت ہی نہیں - اور مصلحت بھی نہیں - بحمد اللہ دستور بنانے والی ہر پارٹی ہر ممبر اور اس کے نظریات سے واقف ہوتے، اس سے رل کر سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ جاری ہے - بہت ہی مایوسی کے بعد اب کچھ امید کی جھلک نظر آنے لگی ہے - ادھر روزانہ ہر رات یہاں جلسے ہو رہے ہیں، ہم نے ان جلسوں کو دستوری کام کا ذریعہ سمجھ کر اپنی شرکت بھی ضروری سمجھی، فتویٰ درس، دار العلوم کے مستقل مشاغل تو دائمی ہیں - ان میں کمی کرنے کی بھی گنجائش نہیں - آپ ایک روز میرے حالات کو دیکھ لیتے، تو حیرت کرتے کہ اس بڑھاپے میں کس قدر یہ سب کام کر رہا ہوں - دستور کے سلسلہ میں جو میمورنڈم اردو اور انگریزی میں طبع کرا کے ارکانِ حکومت و ممبرانِ دستور کو دیا گیا ہے، وہ ارسال ہے "

بندہ ! محمد شفیع عفی عنہ

۱۵ ر نومبر ۱۹۵۵ء

نظام اسلام پارٹی

خوش قسمتی سے اس مرتبہ مجلس دستور ساز میں مشرقی پاکستان کی نظام اسلام پارٹی کی طرف سے حضرت مولانا اشرف علی

تھانوی رح کے خلیفہ مولانا اطہر علی صاحب ممبر منتخب ہو کر آ چکے تھے ۔ نظام اسلام پارٹی نے سب سے پہلے مخلوط انتخاب کے خلاف آواز اٹھائی اور ایک پریس نوٹ جاری کیا، جس میں درج تھا کہ :۔

"مخلوط انتخاب دو قوموں کے اس نظریہ کی مبادیات کے خلاف ہیں جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا ۔ لہٰذا اس سے پاکستان کی جڑوں پر ضرب کاری لگے گی ۔ اسلام میں مخلوط انتخابات کے سسٹم کی اجازت نہیں اور کوئی مسلمان دستور کی تیاری کے لیے اپنے نمائندہ کی حیثیت سے کسی غیر مسلم کو منتخب نہیں کر سکتا ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی زاویہ ہائے نگاہ بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم ہیں ۔ یہ بھی خطرہ ہے کہ مسلمان امیدوار غیر مسلموں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے غیر اسلامی مطالبات اور ناجائز دعاوی قبول کر لیں گے، جس سے قومی مفادات اور بنیادی اصولوں کی قربانی پیش کرنی پڑے گی ۔

غیر مسلم اسلامی آئین کے مخالف ہیں اور وہ انہی مسلمانوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں گے، جن کے رجحانات غیر اسلامی ہوں گے ۔ اس طرح ہندوؤں کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ پاکستان کی بنیادوں کو ہی متزلزل کر دیں "

اس پریس نوٹ کے اخیر میں قرآن و سنت کی بنیادوں پر آئین تیار کرنے کی مبہم الفاظ میں حمایت کی گئی اور انہی مقاصد کی خاطر مولانا اطہر علی مجلس دستور ساز میں مسلسل سعی کرتے رہے ۔

تائید ایزدی

حضرت تھانوی کے خلیفہ مولانا اطہر علی کا ممبر دستور یہ منتخب ہونا تائید ایزدی کی غمازی کرتا تھا کہ حق تعالیٰ نے علماء کرام کی مخلصانہ مساعی کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ان کا ایک نمائندہ اس مجلس میں بھیج دیا' جو ملک کا آئین بنانے والی تھی۔ مولانا اطہر علی اس کمیٹی کے رُکن منتخب کر لیے گئے ' جو دستور کو ترتیب دینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے ۱۶۔ارکان تھے 'جن میں سے پانچ مولانا اطہر علی کے ساتھ تھے اور مولانا اطہر علی کی پشت پر نظام اسلام پارٹی اور جمیعۃ علماء اسلام تھی۔ گویا ان دونوں پارٹیوں نے آئین مرتب کرنے والی پارٹی کے اندر اپنا مضبوط محاذ قائم کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں اندر کی تازہ بتازہ خبریں ہر وقت پہنچتی رہتی تھیں ۔ دستور مرتب کرنے والے ارکان کی کیفیات وحالات اور ارادوں سے آگاہی ہوتی رہتی تھی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان مناسب حال ہدایات دے کر مولانا اطہر علی کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرتے رہتے تھے اور اس طرح ارباب اقتدار اور علماء کرام کے درمیان اسلامی آئین تیار کرنے کے معاملہ میں افہام و تفہیم کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ جس کے بہت ہی مفید اور خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ بخلاف اس کے جماعت اسلامی کو یہ سہولت اور آسانیاں میسر نہ تھیں۔ مخصوص کمیٹیاں تو بجائے خود رہیں۔ دستور یہ میں بھی ان کا کوئی جماعتی نمائندہ موجود نہ تھا۔ جہاں اصل کام ہو رہا تھا۔

منافقت و بغاوت

بلکہ ارباب اقتدار اسے بدستور ایک باغی جماعت تصور کرتے تھے اور اس کی دستوری مہم کو منافقت سے تعبیر کرتے تھے اور اس کی کسی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ یہ جماعت

دستوری مہم کے سلسلہ میں جو اشتہارات، پمفلٹ اور مضامین شائع کر رہی تھی، ان کا لب و لہجہ مصالحانہ نہیں تھا، معاندانہ تھا۔ ان سے پستول کا کام لیا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف عوام میں "جائزہ" تقسیم کر کے انہیں اربابِ اختیار کے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا کہ:۔

"خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو دنیا کی رہنمائی اور فرمانروائی کے منصب سے ہٹا دو اور زمامِ کار مومنین صالحین کے ہاتھ میں دو۔ تاکہ زندگی کی گاڑی ٹھیک ٹھیک اللہ کی بندگی کے راستے پر چل سکے۔" (آخری صفحہ)

جماعت اسلامی جہاں اربابِ اختیار سے عنانِ اقتدار چھیننے کی تیاریوں میں مصروف تھی، وہاں وہ عوام میں ان علماء ربانی کی عظمت اور اہمیت گھٹانے میں بھی مشغول تھی جو آئین اسلامی کے لیے مخلصانہ اور بے غرضانہ جدوجہد میں مصروف تھے۔ چنانچہ جو کچھ جناب مودودی صاحب سرگودھا میں خواص کے مجمع میں فرما چکے تھے، وہی جماعت اسلامی اپنے "جائزہ" کے ذریعہ عوام کے کانوں تک پہنچا رہی تھی کہ:۔

"اگر جماعت اسلامی خدانخواستہ ناکام ہو گئی، تو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی "نئی روشنی" سے متاثر نسلوں کو الحاد و اباحیت کی طاقتوں سے بچانے والی کوئی منظم طاقت موجود نہ رہے گی اور علماء کرام اپنے بل بوتے پر یہ خدمت انجام نہ دے سکیں گے انہیں اس امر کا بھی یا تو شعور نہیں ہے یا ہے تو اس کی کوئی قدر ان کی نگاہ میں نہیں ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے اور یہاں اقتدار کی مسند پر بے دینی کی جگہ دین کو لانے کے لیے جماعت اسلامی کی

کوششیں کیا اہمیت رکھتی ہیں - اور ان کے ناکام ہوجانے کی صورت میں
یہاں اشتراکیت یا "کمالیت" کو مسلط ہوجانے سے روک دینا تنہا علماء
کے بس کا کام نہیں "۔ (جائزہ صد ۵)

مودودی صاحب اور جماعت اسلامی علماء کرام کو علوم دین کا ماہر تسلیم کرنے کے باوجود دنیوی معاملات کو سمجھنے سے اس لیے نااہل اور بے شعور قرار دے رہی تھی کہ اس نے ارباب اختیار سے اقتدار چھیننے کے لیے جو مہم شروع کر رکھی تھی۔ علماء کرام اس کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ اُن سے اس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ اس معاملہ میں شرعی پوزیشن یہ تھی کہ :-

"مسلمان کسی امام پر جب جمع ہوجائیں اور اس امام کی وجہ سے امن ان کو حاصل ہوجائے۔ پھر اسی امام کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کوئی ٹولی اگر اٹھ کھڑی ہو، تو دیکھنا چاہیے کہ امام کے کس ظلم کی وجہ سے کھڑے ہوئے ہیں۔ تو اس وقت امام کو چاہیے کہ ظلم کو ترک کر دے اور ان لوگوں کے ساتھ انصاف کرے۔ مگر عام مسلمانوں کو اس صورت میں چاہیے کہ نہ تو وہ امام ہی کی مدد کریں، کیونکہ یہ تو ظلم پر اعانت ہوگی اور نہ اُس ٹولی کی اعانت کریں۔ کیونکہ امام کے خلاف خروج کرنے والوں کی یہ اعانت ہوگی۔ لیکن اگر یہ ٹولی کسی ظلم کی وجہ سے کھڑی نہیں ہوئی بلکہ اپنے آپ کو حکومت کا حق دار ٹھہراتی ہو اور مدعی ہو کہ حکمرانی کی جائز حقدار وہی ہے تو جنگ کرنے کی جس میں بھی صلاحیت ہو، چاہیے کہ وہ اس ٹولی کے مقابلہ میں امام کی مدد کرے جس نے امام کے خلاف کے مقابلہ میں خروج کیا ہے "۔ (شامی صد ۴۲۷)

اسی لیے مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ

"احمد بن محمد بن حنبل علیہ الرحمۃ بغدادی (۱۶۴ھ تا ۲۶۱ھ) کے نام اور کارناموں سے پڑھے لکھے مسلمانوں میں کون ناواقف ہے ؟ آپ کی عظمت سے کس کا دل خالی ہے ؟ پھر ایک اہم دینی واعتقادی مسئلہ (خلق قرآن) کی بناء پر آپ کو جو شدید عقوبتیں اور اذیتیں، ایک نہیں تین تین معاصر فرمانرواؤں (مامون، معتصم، واثق) کے ہاتھ سے اٹھانا پڑیں، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ۔ پکڑے گئے، مارے گئے، جیل میں بند کیے گئے ۔ لیکن اس کے باوجود کیا آپ نے یہ فتویٰ بھی کبھی جاری کیا کہ ایسی عاصی اور فاسق حکومتوں پر خروج واجب ہے ؟ اور تحفظ عقائد کی خاطر ایسی حکومتوں کا تختہ الٹ دینا چاہا ؟

امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت الکوفی کا تصادم اپنی معاصر حکومتوں سے کیا کچھ کم رہا ؟ حکومت وقت کی کوتاہیاں، خامیاں، لغزشیں کیا آپ کی نظر میں کچھ کم قابل گرفت تھیں ؟ اس کے باوجود آپ خود ہی اپنی ذات پر سختی جھیلتے رہے لیکن فاسقانہ نظام حکومت کے خلاف کوئی عام تحریک چلائی ؟

اور یہی سوالات کثرت سے قدیم محدثین وفقہاء بلکہ خود تابعین کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں ۔ کیسی کیسی قیامت خیز بدعتیں اور ملوکیت کی زیادتیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ لیکن کتنی بار جہاد کے فتوے ان برائے نام اسلامی حکومتوں کے خلاف دیئے ؟

ان سے بڑھ کر مثال دور یزید کی ہے ۔ جو ہر قسم کے فسق وفجور، ظلم و عدوان کے لیے ایک ضرب المثل ہے ۔ اس وقت تو رسولؐ ہی کے صحابیوں

کی ایک تعداد زندہ تھی، چہ جائیکہ تابعین۔ پھر ان میں سے کسی نے بھی اس نظام فاسقانہ کے خلاف اعلانِ جہاد کیا؟

یہاں تک کہ شہید کربلا نے بھی تلوار اٹھائی، تو محض مدافعت میں، جب آپ کو ہر طرح مجبور و محصور کر دیا۔" (صدق جدید ۱۱ رمارچ ۵۵ء)

مکتوب عثمانی جماعت اسلامی تو تربیتی کارروائیوں میں مشغول تھی اور علماء ربانی ترغیبی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کراچی میں موجود ہونے کی وجہ سے وزراء سے بالمشافہ گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ مگر مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی ارباب اقتدار سے دور رہنے کی وجہ سے بذریعہ خط و کتابت اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء کو انہوں نے حسب ذیل مکتوب چوہدری محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان کی خدمت میں روانہ کیا، جو یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء کے روزنامہ "تسنیم" لاہور اور اخبار "الجماعت" کراچی میں شائع ہوا۔ مولانا عثمانی نے اپنے "تاریخی خط میں لکھا کہ:-

"مجھے آپ کی وزارت عظمیٰ کی خبر سن کر بڑی مسرت ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ نے قائد اعظم اور قائد ملت مرحوم کے ساتھ کام کیا ہے۔ اور ان کو آپ پر اعتماد تھا۔ اس لیے آپ کی وزارت عظمیٰ سے یہ امید قائم ہو گئی تھی کہ اب ان مقاصد کو جلد از جلد پورا کیا جائے گا، جن کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک ہی مہینہ کے اندر ایسی باتیں سننے میں آئیں، جن سے یہ امید یاس میں تبدیل ہونے لگی اور خطرناک صورتیں سامنے آنے لگیں۔ اس بنا پر جناب سے چند سوالات کرنا چاہتا

ہوں۔ امید ہے کہ ان کے تشفی بخش جوابات سے مجھے اور ان سب مسلمانوں ا کو جنہوں نے قائداعظم اور قائد ملت کے بیانات اور مواعید سن کر، جو پاکستان بننے سے پہلے دیئے گئے تھے، ایک خاص نظریہ کے ماتحت اپنا سب کچھ حصول پاکستان کے لیے قربان کر دیا ہے، مطمئن فرمائیں گے۔

۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کی وزارت نے جگتو فرنٹ کا یہ مطالبہ مان لیا ہے کہ پاکستان میں آئندہ انتخابات مخلوط ہوں گے؟ اگر واقعی یہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تو میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ اس دو قومی نظریہ یعنی ٹو نیشنز تھیوری کے بالکل خلاف ہے، جس پر پاکستان کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی جنگ مخلوط اور جداگانہ انتخابات ہی کی جنگ تھی، دو قوموں کے نظریہ کی جنگ تھی۔ اسی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔ حیرت ہے کہ آپ کی وزارت نے سب سے پہلا حملہ پاکستان کے بنیادی نظریہ ہی پر کیا ہے۔ غالباً جناب نے اس کے عواقب میں بھی غور نہیں فرمایا کہ دراصل مخلوط انتخابات کا مطالبہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا مطالبہ ہے۔ چونکہ الیکشن میں جگتو فرنٹ کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں ہندوؤں کی امداد نے کامیاب کیا تھا۔ اس لیے لامحالہ ہندوؤں کے بعض مطالبات اُن کو اپنے اکیس نکاتی پروگرام میں شامل کرنے پڑے۔ مشرقی پاکستان کا ہندو جن کی تعداد سوا کروڑ کے قریب ہے مخلوط انتخاب اس لیے چاہتا ہے کہ شیڈول کاسٹ ہندو پاکستان کی اسمبلی میں نہ آسکیں۔ اونچی ذات

کے ہندو ہی ان کی سیٹوں پر قابض ہو جائیں۔ نیز وہ یہ بھی چاہتے ہیں۔ کہ پاکستان اسمبلی میں مسلمان بھی ایسے ہی پہنچیں جو ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں۔ مخلوط انتخابات کی صورت میں مسلمان ممبروں کو اپنی کامیابی کے لیے ہندوؤں کے ووٹ کی بھی ضرورت ہو گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو گا کہ اسمبلی میں وہی مسلمان زیادہ آسکیں گے، جو ہندوؤں کے غیر اسلامی نظریات کو پاکستان میں فروغ دینا چاہیں گے۔ پھر مخلوط انتخاب میں جب ہندو مسلمان کی تمیز باقی نہ رہے گی، تو پاکستان ایک حقیقی اسلامی ملک ہرگز نہیں بن سکتا اس لیے ایسی غلطی ہرگز نہ کی جائے۔ حسب دستور سابق انتخابات جداگانہ ہی ہونے چاہئیں، ورنہ آپ کی وزارت آپ کے پیشرو محمد علی کی وزارت سے بھی زیادہ بدنام ہو جائے گی۔ ان کی غلط سیاست نے تو مسلم لیگ کو مشرقی بنگال میں ختم کیا تھا اور اگر آپ نے مخلوط انتخاب مان لیا تو آپ پاکستان کی بنیاد ہی ختم کر دیں گے۔

۲۔ کیا یہ صحیح ہے کہ جگتو فرنٹ کے لیڈروں کو "مشرقی پاکستان" نام پسند نہیں؟ وہ صرف اس کا نام مشرقی بنگال یا صرف بنگال رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے تو جن لوگوں کو پاکستان کا نام بھی پسند نہیں، ان کو اپنا پاکستانی ہونا کیسے پسند ہو گا؟ پھر ان کو پاکستان کی سالمیت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ تو ان مسلمان لیڈروں کا حال ہے، جو مخلوط انتخاب سے نہیں بلکہ صرف ہندوؤں کی امداد سے کامیاب ہو کر اسمبلی میں آئے ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیا جائے کہ جو مسلمان ہندوؤں کے ووٹ سے

کامیاب ہو کر آئیں گے، وہ کیا کچھ ہوں گے؟ پھر جس ملک کا مشرق نہ رہا، اس کے مغرب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو مغربی پاکستان کا نام بھی ختم ہوا تو کیا ایسے ہی ممبروں کے ساتھ مِل کر آپ اسلامی دستور بنائیں گے؟ جس کا وعدہ آپ نے وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سنبھالتے ہی قوم سے کیا ہے؟

۴۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ہندو ممبران اسمبلی نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کے نصاب تعلیم سے "اسلامیات" کا مضمون حذف کر دیا جائے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں وہی نصاب تعلیم چاہتے ہیں۔ جو انگریز کے زمانہ میں تھا۔ مسلمان اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی ہندو اقلیت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انڈین یونین کا قیام تو ہندو اور نیشلسٹ مسلمانوں کی ملی جلی کوششوں سے وجود میں آیا ہے۔ لیکن پاکستان کا وجود خالص مسلمانوں کی مساعی اور قربانیوں سے عمل میں آیا ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے قائد اعظم اور دیگر زعماء مسلم لیگ کے اعلانات برابر اس قسم کے ہوتے رہتے ہیں کہ مسلمان اپنے لیے ایک قطعہ زمین الگ اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں اسلامی احکام جاری کر کے مسلمان اسلامی زندگی بسر کر سکیں اور ان کا مذہب، تمدن، کلچر، ثقافت اور زبان محفوظ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد قرارداد مقاصد میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ اب اگر ایسی سیدھی اور صاف بات کو بھی بھلا دیا جائے، تو اس کا کچھ علاج کسی کے پاس نہیں۔ جناب والا! اگر ہندوؤں کے اس مطالبہ کو مان کر قرارداد مقاصد کے خلاف راہ عمل اختیار کی گئی، تو مسلمان یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ

موجودہ دستوریہ نمائندہ اسمبلی نہیں ہے۔ کیونکہ جو اسمبلی محض اس وجہ سے کہ مرکزی وزارت کا قیام جگتو فرنٹ کے اتحاد کا مرہونِ منت ہے، پاکستان کے بنیادی نظریات کو پامال کرنے لگے۔ اس کو کوئی مسلمان بھی نمائندہ اسمبلی نہیں مان سکتا۔

امید ہے کہ جناب والا ان سوالات کے تشفی بخش جوابات سے بہت جلد مسلمانوں کو مطمئن فرمائیں گے۔ ورنہ آپ یقین جانیں کہ پاکستان کی سالمیت کو سخت خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تمام آفات سے محفوظ رکھے۔ آمین!

ظفر احمد عثمانی نائب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح
شیخ الحدیث دارالعلوم اشرف آباد۔ ٹنڈو الہ یار سندھ" ۔ ۱

یہ تاریخی خط اس گروہ کے ایک ممتاز فرد کا ہے، جس کے متعلق مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے صحائف کا فتویٰ آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ:۔

"وہ عوام سے بہت حد تک لاتعلق رہتے ہیں۔ انہیں دنیا کے موجودہ حالات اور وقت کے تقاضوں کا کوئی علم نہیں۔ ان کا طرزِ استدلال زمانے کے ذہن سے بہت پیچھے ہے اور وہ حکمراں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔"

اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط ہے دیانتدارانہ ہے یا معاندانہ؟

وزیر اعظم کا جواب

مولانا عثمانی کے متذکرہ بالا خط کا حسبِ ذیل جواب موصول ہوا :-

"پاکستان سیکرٹریٹ کراچی

۸ر اکتوبر ۵۵ء   کرمفرمائے بندہ!

السلام علیکم!

حسب ہدایت عزت مآب وزیر اعظم صاحب آپ کے کرم نامہ اور سوال نامہ کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اطلاعاً عرض ہے کہ پاکستان کے نصابِ تعلیم سے اسلامیات کا مضمون حذف کرنے کی خبر بالکل بے بنیاد ہے اور رقم کردہ سوالات نمبر ا اور نمبر ۲ زیر غور ہیں۔ فقط!

آپ کا خادم!

صدیق علی خاں معتمد سیاسی وزیر اعظم پاکستان"

مکتوب ثانی

مولانا عثمانی نے مذکورہ بالا خط کا فوراً یہ جواب وزیر اعظم پاکستان کو ۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بھیجا :-

مکرمی المحترم دام اقبالہٗ

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میرے عریضے کے جواب میں گرامی نامہ مورخہ ۸ر اکتوبر ۵۵ء پرائیویٹ سیکرٹری کے قلم سے موصول ہو کر موجب عزت ہوا۔ بہت بہت شکریہ!

میں نے اخبار الجماعت کراچی اور اخبار تسنیم لاہور میں پڑھا تھا کہ صوبائی

اسمبلی کے ہندو ممبران مشرقی پاکستان میں یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کے نصاب تعلیم سے دینیات کا مضمون حذف کر دیا جائے۔ اندیشہ ہے کہ جگتو فرنٹ کے ممبروں سے ساز باز کر کے صوبہ میں وہ کامیاب ہو جائیں گے۔

میرے سوال نمبر۱، نمبر۲ کے بارہ میں تحریر یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ زیرِ غور ہیں۔ مگر ما! یہ دونوں مطالبے ہرگز اس قابل نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ ان کو فوراً رد کر دینا چاہئیے۔ آخیر میں ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ جب کوئی چھوٹی سلطنت کسی بڑی سلطنت کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر دیتی ہے اور اس کے قوانین اپنے یہاں رائج کر دیتی ہے تو بڑی سلطنت کی قوت اور مدد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کے دن اچھے تھے، انہوں نے اپنی سلطنت کو سب سے بڑی سلطنت یعنی حکومتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ اس کے قوانین اپنے یہاں رائج کر دیئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غیبی طاقت ان کے ساتھ تھی۔ یہی اب کیا جائے تو غیبی امداد آپ کے ساتھ ہو گی۔

پاکستان اس وعدہ پر اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا کہ اس کو ایک مثالی اسلامی مملکت بنایا جائے گا۔ مگر افسوس! یہ وعدہ اب تک شرمندۂ ایفاد نہیں ہُوا۔ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دیانت و امانت، خداترسی و پرہیز گاری اور اخلاقی معاشرتی پہلو سے

اس وقت پاکستانی مسلمان بجائے ترقی کے بہت تنزل کی طرف جارہے ہیں ضرورت ہے کہ اس وعدہ اور مقصد کو جلد سے جلد پورا کیا جائے۔ ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ قدرت کی طرف سے کس طرح بار بار ہم کو متنبہ کیا جارہا ہے۔ ہر سال سیلاب وغیرہ سے اس قدر نقصان پاکستان کو پہنچتا ہے کہ اس کی ساری ترقی خاک میں مل جاتی ہے۔ قدرت ہم کو خبردار کرتی ہے کہ کافروں کے طریقہ پر ترقی کروگے تو حق تعالیٰ ساری ترقیوں کو ذراسی دیر میں ملیامیٹ کرکے رکھ دے گا۔ اسلامی مملکت کی ترقی کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے کو حکومت الٰہیہ سے وابستہ کرکے خدائی قانون کو اپنا کر ترقی کرے۔ الذین مکنٰھم فی الارض۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں تمام معاملات کا انجام ہے۔ اسی سے مسلمانوں کو وابستہ ہونا چاہیئے۔

امید ہے ان معروضات پر غور فرمایا جاوے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی وزارت کو استحکام و قوت عطا فرمائے اور آپ کے ذریعہ سے پاکستان میں دستور اسلامی و قانون شرعی جلد سے جلد نافذ ہو جائے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی سلطنت بن جائے۔ والسلام مع الاحترام!

ظفر احمد عثمانی!"

درسِ عمل

اس کے قریباً ایک ماہ بعد کراچی میں چوہدری محمد علی وزیر اعظم پاکستان نے سیرت کے جلسہ میں ایک اہم تقریر فرمائی۔ جس کا ریکارڈ ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا۔ اس میں انہوں نے امت مسلمہ کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ

علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی پر اس تقریر کا یہ ردعمل ہوا کہ انہوں نے اسی وقت وزیر اعظم پاکستان کو ایک تبلیغی خط لکھا اور انہیں اپنے کہے پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات شہری ہنگاموں سے دور دراز مسجدوں اور خانقاہوں میں رہنے کے باوجود حالاتِ زمانہ اور رفتارِ دنیا سے بے خبر نہیں ہوتے، جتنا ان کو ظاہر کیا جاتا ہے بلکہ درس و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کی چشمِ فراست پیش آمدہ واقعات کا بھی جائزہ لیتی رہتی ہے۔ جس کی تائید مندرجہ ذیل خط سے ہوتی ہے، جو مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ۹ر نومبر ۵۵ء کو وزیر اعظم پاکستان کے نام لکھا:۔

"محترم المقام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں نے ۱۲ ربیع الاوّل کو آپ کی تقریر دلپذیر کا ریکارڈ سنا۔ جو آپ نے جلسۂ سیرت کراچی میں کی تھی۔ ماشاء اللہ بہترین تقریر تھی۔ مگر دل یہ چاہتا ہے کہ تقریر سے زیادہ آپ کی حکومت کا عملی کارنامہ سامنے آئے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے رسولؐ کی سیرت پر عمل پیرا ہو جائیں، تو کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ وزیر اعظم اور ان کی حکومت ایسا رویہ اختیار کرے جس سے قوم خود بخود اسوۂ رسولؐ پر چلنے لگے۔ مثال کے طور پر تمام خرافات بند کر دی جائیں، جن سے مسلمانوں کے اخلاق و اعمال خراب ہوتے ہیں۔ جیسے شراب کی خرید و فروخت، سینما۔ جوا بازی۔ جس میں معمہ بازی بھی داخل ہے۔ رنڈی خانے، فحش لٹریچر وغیرہ وغیرہ یک لخت بند

کر دیئے جائیں۔ دستورِ اسلامی کا جتنا حصّہ ناظم الدین بی، پی، سی رپورٹ میں طے ہو چکا ہے۔ اس کو بحال رکھا جائے۔ صرف اس کی خامیاں دور کر دی جائیں جو ترمیماتِ علماء سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ عدالتوں میں بہت جلد شرعی قانون نافذ کیا جائے جو فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ جس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ نصابِ تعلیم میں دینیات و اخلاق کی تعلیم پر زور دیا جائے۔

مجھے اخبارات سے یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا کہ اسلامی دستور کا جو مسودہ آپ کی حکومت قوم کے سامنے لانے والی ہے، اس میں سے رہنما اصول کا باب نکال دیا گیا ہے۔ قراردادِ مقاصد بھی بدل دی گئی ہے اور وہ دفعات بھی نکال دی گئی ہیں، جن میں کتاب و سنت کی پابندی کو تمام قوانین میں لازم کیا گیا ہے۔ صدرِ جمہوریہ کے لیے اسلام کی شرط نہیں رکھی گئی۔ اگر آپ کی حکومت کا عملی کارنامہ یہی ہو گا، تو سیرت پر تقریر کرنا محض بیکار ہے۔ آپ کو سوچنا چاہئیے کہ اس وقت پاکستان سخت نازک دور سے گذر رہا ہے۔ مخالف طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں اس وقت حکومت کو اللہ کی مدد اور قوم کے تعاون کی سخت ضرورت ہے اگر دستورِ پاکستان کا نمونہ وہی ہوا، جو اخبارات سے معلوم ہو رہا ہے، تو نہ خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہو گی، نہ قوم کا تعاون آپ کو حاصل ہو گا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ پہلے سے زیادہ انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ہم نے پاکستان اس لیے حاصل نہیں کیا تھا کہ اس میں مخلوط انتخاب رائج کر کے دو قومی نظریہ

کو باطل کر دیں، جو پاکستان کی بنیاد ہے اور اس کا دستور بھی غیر اسلامی یعنی سیکولر بنائیں۔ امید ہے کہ ان حقائق کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔

ظفر احمد عثمانی!"

وعدۂ سعیِ حاصل "صالح ترہیب" کے مقابلہ میں یہ مخلصانہ اور حکیمانہ ترغیب زیادہ مؤثر ثابت ہوئی اور چوہدری محمد علی صاحب نے اس خط کا جواب اپنے قلم سے حسب ذیل دیا:۔

"محترمی! السلام علیکم۔ آپ کے گرامی نامہ کا شکریہ! جو مشورے آپ نے دیئے ہیں، ان پر حتی الوسع عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں گا۔ والسلام!

مخلص! محمد علی!

وزیر اعظم کے دونوں خطوط اخبارات کی اطلاعات اور علماء کے خدشات کی تائید کرتے تھے۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے نصاب تعلیم سے اسلامیات کے مضمون کو حذف کر دینے والی خبر کی فی الفور تردید کر دی تھی، اسی طرح ان اطلاعات وخدشات کی تردید نہ کی گئی۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت ارباب اختیار و اقتدار نازک صورتِ حالات سے دوچار تھے۔

مایوس کُن حالات حالات کی نزاکت کا اندازہ ان امور سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:۔

۱۔ ہر فرد اور ہر جماعت نے اپنی اغراض وخواہشات کا نام "اسلام" رکھ رکھا تھا جو فارمولا یا جو مسودہ خواہ وہ حرف بہ حرف قرآن وسنت کے مطابق کیوں نہ ہو جس جماعت کو منظور نہ ہوتا، وہ فوراً اس کے غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ

صادر کر دیتی۔

۲۔ ملک میں کوئی ایسا ہر دلعزیز، مخلص اور دیانتدار سیاسی رہنما موجود نہ تھا۔ جسے پاکستان کے دونوں حصّوں میں محبوبیت و مقبولیت حاصل ہوتی۔ جو اپنی حکمت عملی سے دونوں حصوں کا اعتماد حاصل کر سکتا اور جس کے ایک اشارہ پر قوم ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔

۳۔ ملک میں ایسی کوئی سیاسی جماعت بھی موجود نہ تھی، جو ملک کے دونوں حصّوں کے لیئے قابل قبول قیادت کے فرائض انجام دے سکتی۔

۴۔ صحیح قیادت کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ شہید حسین سہروردی جن کے متعلق توقع تھی کہ وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں حصّہ ہائے ملک کے عوام کا اعتماد حاصل کر لیں گے، وقتی مصلحتوں کا شکار ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مغربی پاکستان کا اعتماد کھو بیٹھے تھے۔ ان کی عوامی لیگ دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور وہ محض ایک صوبہ بلکہ ایک گروہ کے لیڈر بن کر رہ گئے تھے۔

مشرقی پاکستان کے دیگر صوبائی زعماء کو ان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے مغربی پاکستان کے عوام کا اعتماد حاصل نہیں تھا۔ مغربی پاکستان کے صوبوں کے ایک وحدت میں بدل جانے سے یہاں کے صوبائی لیڈروں کی حیثیت بھی گو کہ علاقائی یا ڈویژنل لیڈروں کی سی رہ گئی تھی۔ جن کو مشرقی پاکستان کے نمائندے اپنا آلہ کار بنانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ مودودی صاحب کو اپنے مخصوص نظریات رکھنے کی وجہ سے سوائے اپنی جماعت کے چند ہزار ممبروں کے دوسروں کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میدان سیاست و قیادت میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں

کو اہمیت و فوقیت حاصل ہو گئی۔ ان میں سے اکثر کو چونکہ مشرقی پاکستان کے سوا کروڑ ہندو آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے، اس لیے وہ آئینِ اسلامی کے نفاذ کی راہ میں ہر ممکن روڑا اٹکا کر ہندوؤں کا حقِ نمک ادا کرنے پر مجبور تھے۔ بدقسمتی سے مرکزی قیادت و وزارت پارٹی سسٹم پر وجود میں آئی تھی، اس لیے مشرقی پاکستان کے نمائندوں کے مطالبات کو نظر انداز کرنا بڑا مشکل تھا اور ان کی مشکل کا اندازہ خود گورنر جنرل کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے، جو انہوں نے مشرقی پاکستان میں کی اور جس میں کھلے لفظوں میں یہ تنبیہ کرنے کے باوجود کہ:۔

"پاکستان سے علیحدگی کی باتیں کرنا کھلی غداری ہے اور اس کا ارتکاب وہی شخص کر سکتا ہے، جس کی وفاداریاں غیر ملکوں کے ساتھ ہوں۔ اور بدقسمتی سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دونوں جگہ ایسے افراد موجود ہیں"۔

ان کی حکومت ۱۹۵۰ء کے اس قانون کو حرکت میں نہ لا سکی، جو صرف ایسے غداروں کے لیے بنایا گیا تھا۔

جمہوریت کی گاڑی ہمیشہ مختلف الخیال، مختلف المزاج، اور مختلف المفاد عناصر کی مشترکہ مساعی سے چلتی ہے اور جونہی اس کے چلانے والے مشترکہ مفاد اور مشترکہ مقصود کو نظر انداز کر کے اپنے اپنے مفاد کی فکر کرنے لگتے ہیں، جمہوریت کی گاڑی کی رفتار میں ناقابلِ برداشت فرق پڑ جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ رک کر جماعتی آمریت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسے ہی حالات سے اس وقت پاکستان اور اربابِ پاکستان دوچار تھے۔ اگر ایسے نازک وقت میں اربابِ حکومت جماعت اسلامی کے سے طور طریقے اختیار کرتے اور حکومت عملی سے کام نہ لیتے

تو ملک ناقابلِ تصور طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتا۔ اس لیے وہ جہاں علماء ربانی کی حق گوئیوں کو برداشت کرتے رہے، وہاں اربابِ غرض کی ناز برداریاں بھی سہتے رہے اور ایک ایسا درمیانی راستہ تلاش کرتے رہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔ عوام و علماء کا مطالبہ بھی منظور ہو جائے اور ہندو سیاست بھی ناکام رہ جائے یہ چوہدری محمد علی صاحب وزیرِ اعظم پاکستان کی اسلامیت، اخلاص، دردمندی اور حب الوطنی کی کرامت تھی کہ جو کام ان کے تین پیش رو آٹھ سال کے عرصہ میں مکمل نہ کر سکے۔ وہی کام انہوں نے شبانہ روز کی جدوجہد سے کولیشن پارٹی کی اعانت سے چند مہینوں میں مکمل کرا لیا۔

مسوّدہ اسلامی آئین

جو ۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو منظرِ عام پر آگیا۔ اس روز پاکستان کے وزیرِ قانون مسٹر آئی، آئی چندریگر نے اسلامی دستور کا مسوّدہ دستوریہ میں پیش کر کے اہلِ پاکستان کی دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ جس کا مشرقی پاکستان کے مفاد پرست طبقہ کے سوا ملک کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے پرجوش خیر مقدم کیا۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں اسلامی آئین پیش ہونے پر جہاں اسلامی ممالک سے بھی مبارکبادی کے تار آرہے تھے، وہاں اربابِ عوامی لیگ اپنے بازوؤں پر سیاہ ماتمی پٹیاں باندھ کر اس آئین کی مخالفت کرنے کے عزم سے ایوانِ دستوریہ میں داخل ہو رہے تھے۔ دستوریہ کے اندر اربابِ غرض نے پھر سے حالات پیدا کرنے کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس دستوریہ کا حشر بھی سابقہ دستوریہ کا سا ہو۔ مگر چونکہ گورنر جنرل اور وزیرِ اعظم اس اجلاس میں آئین پاس کراتے پر تلے ہوئے تھے۔

اس لیے اُن کی کچھ پیش نہ گئی۔

سعیِ ترمیم و اصلاح

نیا مسودۂ آئین کوئی آسمانی نوشتہ نہیں تھا کہ وہ اسقام سے پاک ہوتا۔ آخر انسانی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا۔ اس لیے جہاں وہ بہت سی اسلامی اور جمہوری خوبیوں کا حامل تھا، وہاں اس میں بعض ایسی دفعات بھی دانستہ یا نادانستہ رکھ دی گئی تھیں، جس سے اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔ جس کے لیے ساڑھے آٹھ سال سے جدوجہد کی جا رہی تھی۔ مثلاً اسلامی نظام کی بنیادی دفعہ ۲۰۵ کی پہلی شق میں تو یہ کہا گیا تھا کہ ایسا کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، جو قرآن و سنت کے بیان کردہ اسلامی احکام کے خلاف ہو اور موجودہ قوانین کو بھی ان احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا۔ یہاں تک تو الفاظ اطمینان بخش تھے۔ لیکن اس دفعہ کی شق (۲) میں ان کو "صرف" سے مشروط کر دیا گیا تھا کہ مذکورہ بالا دفعہ ۲۰۵ کو "صرف" اس طریقہ سے عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ جو شق (۳) میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بتلاتی ہے کہ:۔

"یوم دستور کے بعد ایک سال کے اندر صدر ریاست ایک کمشن مقرر کرے گا تاکہ:۔

الف: وہ ایک موزوں صورت میں نیشنل اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لیے ان اسلامی احکام کا ایک مجموعہ مرتب کرے جنہیں قانون کی شکل دی جا سکتی ہو اور

ب: اس امر کی سفارش کرے کہ (۱) کس طرح کس تدریج کے ساتھ اسلامی احکام کو نافذ کیا جائے اور (۲) موجودہ قوانین کو ان

احکام کے مطابق بنایا جائے۔ یہ کمشن اپنے تقرر کے بعد پانچ سال کے اندر اپنی آخری رپورٹ پیش کرے گا اور اس دوران میں کوئی عارضی رپورٹ بھی پیش کرے گا۔ یہ رپورٹ خواہ وہ آخری ہو یا درمیانی، جب وصول ہو، تو چھ مہینے کے اندر اسے نیشنل اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اور اسمبلی اس پر غور کرنے کے بعد اس کے لحاظ سے قوانین بنائے گی"۔

اس سے :-

۱- اسلامی قوانین کا نفاذ سات سال دُور جا پڑا۔

۲- کمشن کے افراد کی نوعیت و صلاحیت کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے قرآن و سنت کے احکام کی غلط ترجمانی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

۳- کمشن کی رپورٹ کی پابندی قومی پارلیمنٹ کے لیے لازمی قرار نہ دینے سے اسے کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ آئندہ قانون سازی میں قرآن و سنت کے احکام کا لحاظ کرے یا نہ کرے۔

۴- کمشن کی رپورٹ کو ہی اسلامی احکام کا دائرہ ماخذ بنا دیا گیا۔ خواہ اس کی رپورٹ قرآن و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ حرف "صرف" کی موجودگی قرآن و سنت سے کوئی دلیل و حجت پیش کرنے سے مانع تھی۔

اس طرح دفعہ ۵-۱ کے ذریعہ قرآن و سنت کی جو پابندی عائد کی گئی تھی وہ اس کی شق (۳) کے ذریعہ ختم کر دی گئی۔ چنانچہ اس کی طرف سب سے پہلے مولانا محمد احتشام الحق صاحب تھانوی نے اربابِ دستوریہ کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کی قائم کردہ سب کمیٹی نے بھی اپنے

تبصرہ میں اس اور اس جیسی دوسری خامیوں کی نشان دہی کی۔

متحدہ کوشش اس وقت اربابِ اختیار تو اپنے اپنے مفاد کے لیے رسّہ کشی میں مصروف تھے اور ملک کی مختلف مذہبی جماعتیں اربابِ اقتدار تک عوام کی آواز پہنچانے کے لیے مشرقی و مغربی پاکستان میں ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ ۱۲ر فروری ۱۹۵۶ء کو مشرقی پاکستان میں "اسلامی آئین کی کل جماعتی کمیٹی" کے زیر اہتمام ایک شاندار جلسہ ہوا۔ جس میں مولانا راغب احسن صاحب نے مطالبہ کیا کہ مصر و شام کی طرح پاکستان میں اسلام کو سرکاری مذہب کا درجہ دیا جائے اور مولانا عبدالسلام اور مولانا امین الاسلام نے حکومت پر واضح کیا کہ مشرقی پاکستان کی نوّے فیصدی آبادی اسلامی آئین چاہتی ہے۔ اور مملکت کے مجوزہ نام کی مخالفت اور مخلوط انتخابات کی حمایت کرنے والے مشرقی پاکستان کے نمائندے نہیں اور حکومت کو متنبہ کیا کہ آئین سے موجودہ اسلامی دفعات کو ہٹانے اور ان کی جگہ غیر اسلامی آئین ٹھونسنے کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔

اسی دن مغربی پاکستان کے مرکز لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام، جمعیۃ اہل حدیث، عوامی مسلم لیگ، جمہور اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کی طرف سے مشترکہ اہتمام کے ساتھ ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر حکومت سے ایک قرار داد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ:۔

"پاکستان کی مذہبی و سیاسی جماعتوں کے زیر اہتمام اسلامیانِ لاہور کا یہ اجتماع انتہائی صاف اور واشگاف الفاظ میں کارفرمایانِ حکومت اور

ارکانِ دستور یہ کو اس حقیقت کا احساس دلانا ضروری سمجھتا ہے کہ دستوری ترتیب و تدوین کے اس فیصلہ کُن مرحلہ پر مسودۂ دستور کی اسلامی دفعات جس بیدردی سے التوا کا شکار بنائی گئی ہیں اور ملک کے نمائندہ اداروں کی طرف سے پیش کردہ مفید ترین جمہوری ترمیمات کو جس بے نیازی سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ ملّت کے لیے بے پناہ ہیجان و اضطراب کا باعث ہے۔ اس مرحلہ پر اگر اسلامی نظریات و جمہوری احساسات پسِ پشت ڈال دیئے گئے اور اسلامیانِ پاکستان کی اُمنگوں اور اسلامی منشاء کے مطابق تلافی و مافات کی کوشش نہ کی گئی، تو یہ شدید خطرہ ہے کہ ملّت اس دستور کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔"

متفقہ ترامیم علماء کرام اور ملک کی مذہبی جماعتوں نے اس دفعہ بھی کامل ہم آہنگی کا ثبوت دیا اور جمیعۃ علماء اسلام، جمیعۃ علماء پاکستان، جمیعۃ اہل حدیث، جماعتِ اسلامی اور نظام اسلام پارٹی نے مسودۂ دستور پر غور و خوض کرنے کے بعد اپنی متفقہ ترامیم ارکانِ دستور یہ تک پہنچا دیں۔ جن کی تائید ملک کے طول و عرض میں عوام الناس نے وزراء اور ارکانِ دستور یہ کے نام ہزاروں تار، خطوط اور قرار دادیں بھیج کر کی۔ ان متفقہ ترامیم کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

۱- کسی شخص کو اس کا قصور ثابت کیے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر قید کر دینے کی دستور میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اگر ارکانِ دستور یہ اسے برقرار رکھنے پر ہی مصر ہوں تو دفعہ ۷ (۴) میں یہ ترمیم

کی جائے " جس شخص کو احتیاطی نظر بندی کے کسی قانون کے تحت گرفتار کیا جاوے۔ اسے پندرہ دن کے اندر واضح فردالزام کے ساتھ عدالت کے سامنے پیش کیا جائے - ملزم کو صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔ صرف عدالت ہی یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہو کہ کسی ملزم کو نظر بند کیا جائے یا نہیں اور اگر کیا جائے تو کتنی مدت کے لیے اور فقرہ استثنائیہ (PROVISO) لازماً حذف کیا جائے۔

۲- بنیادی حقوق ، اظہار خیال ، اجتماع ، انجمن سازی ، نقل و حرکت اور ملکیت رکھنے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کے سلسلہ میں " ہر پابندی " کے بجائے " ہر معقول پابندی " کے الفاظ رکھے جائیں تاکہ عدالتوں میں شنوائی کی گنجائش باقی رہے -

۳- انسدادِ ربوا سے متعلق سابقہ رپورٹ میں درج شدہ دفعہ کو جو موجودہ مسودہ میں سے نکال دی گئی ہے ، شامل کیا جائے -

۴- انتظامیہ سے عدلیہ کی علیحدگی کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی ہے - اس کے لیے سابقہ رپورٹ کی طرح تین سال کی مدت مقرر کی جائے -

۵- صدر ریاست کو اسمبلی توڑنے کا اختیار ہرگز نہ دیا جائے اور وزیر اعظم اس وقت تک اپنے منصب پر فائز رہے ، جب تک اسے نیشنل اسمبلی کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے - اسی طرح صوبوں میں گورنروں کو اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی وہ وزیر اعلیٰ کو برطرف کر سکیں -

- مسوداتِ قانون پر صدر یا گورنر کے دستخط کے لیے ایک معین مدت ہونی

چاہیے۔ پندرہ یوم کا تعین مناسب ہے۔ بعض ممالک میں اس سے بھی کم ہے۔

۷۔ صدرِ ریاست اپنے مخصوص اختیارات کے سوا باقی تمام اختیارات مجلس الوزراء کے مشورے سے استعمال کرے۔

۸۔ سپریم کورٹ اس کا مجاز ہونا چاہیے کہ وہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل سن سکے۔

۹۔ ہائی کورٹوں کے ججوں کے تقرر کے سلسلہ میں صوبائی گورنروں کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

۱۰۔ دفعہ ۲۰۰ جس کی رو سے ہنگامی صورت حال میں تمام یا بعض بنیادی حقوق عملاً معطل کیے جا سکتے ہیں اور سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں کے اختیارات سلب کیے جا سکتے ہیں، قطعی طور پر حذف ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس سے آمریت کا دروازہ کھلتا ہے۔

۱۱۔ سپریم کورٹ کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ یہ تحقیق کر سکے کہ ہنگامی حالت کا اعلان جائز تھا یا نہیں۔

۱۲۔ دستور میں یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ یوم دستور کے بعد کتنی مدت کے اندر ملک میں عام انتخابات منعقد کیے جائیں۔

۱۳۔ دستور میں یہ صراحت ہونی چاہیے کہ غیر ممالک سے جتنے معاہدات ہوں گے، ان کے لیے پارلیمنٹ کی توثیق ضروری ہوگی۔

۱۴۔ مارشل لاء کے متعلق اگر دستور میں کوئی دفعہ رکھنی ہے، تو وہ صرف اس

مفہوم کی حامل ہونی چاہیئے کہ اگر ملک کے کسی حصّہ میں اندرونی مسلح بغاوت نمودار ہوجائے، جس پر قابو پانے سے حکومت کی عام مشینری قاصر ثابت ہو یا جنگ کی حالت میں دفاعی اغراض کے لیے کابینہ کے مشورہ پر صدرِ مملکت خصوصی اعلان کے ذریعہ متعلقہ علاقے میں مارشل لاء کا نفاذ کرسکے گا۔ مارشل لاء اس کم سے کم مدت تک نافذ رہ سکے گا، جو نظم و امن کی بحالی کے لیے ناگزیر ہو، فوجی احکام کا کام نظم و امن کی بحالی تک محدود ہوگا۔ مارشل لاء کے تحت قائم شدہ عدالتوں کو شہریوں پر مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔ اِلاّ یہ کہ کوئی شخص مسلح بغاوت میں عملاً شرکت یا بصورت بیرونی حملہ غیر ملکی فوج کی عملاً مدد کرتا ہوا پایا جائے۔ نیز یہ کہ مارشل لاء کے قواعد کا اطلاق کسی ایسے فعل پر نہ ہوگا، نہ کسی ایسے جرم پر مارشل لاء کی کوئی عدالت مواخذہ کی مجاز ہوگی، جس کا ارتکاب مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے ہوا ہو۔

۱۵۔ اسمبلی کی رکنیت کے لیے صرف وہ شخص نااہل قرار پائے جس کو کسی "اخلاقی جرم" کی بناء پر سزا دی گئی ہو۔

۱۶۔ عربی زبان کو وہی حیثیت دی جائے جو سابق دستوری خاکہ میں تجویز کی گئی تھی۔

۱۷۔ دفعہ ۲۰۵ (۱) کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن و سنت کے احکام، ہدایت اور اصولی تعلیمات کے خلاف ہو (جنہیں اس کے بعد اسلامی احکام کے نام سے یاد کیا جائے گا) اور اگر کسی مسودہ قانون کے متعلق مجلسِ قانون ساز میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ یا "اس کا کوئی جزء" اسلامی احکام

کے خلاف ہے، تو اس کا فیصلہ اس مجلس کے مسلمان ارکان کی اکثریت کرے گی۔

۲۔ مالی مسودات قانون پر شق (۱) کا اطلاق اس طریقے سے ہوگا جو شق (۴) میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ موجودالوقت قوانین کو اسلام کے احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد کی صورت وہ ہوگی، جو شق (۴) میں تجویز کی گئی ہے۔

۴۔ یوم دستور کے بعد ایک سال کے اندر صدر مملکت ایک کمیشن ماہرین احکام اسلام اور ماہرین قانون وانتظام کی مساوی تعداد پر مشتمل مقرر کرے گا تاکہ وہ :-

(ف) اس بارے میں سفارشات پیش کرے کہ :-

(۱) مالی مسودات قانون پر شق (۱) کے اطلاق کے لیے کیا تدابیر کس تدریج کے ساتھ اختیار کی جائیں اور

(۲) موجودالوقت قوانین میں اسلامی احکام کے لحاظ سے کیا اصلاحات مطلوب ہیں اور ان کو کس طرح ایسی تدریج کے ساتھ عمل میں لایا جائے کہ یوم دستور سے دس سال کے اندر یہ سب قوانین ان احکام کے مطابق ہو جائیں جس کے گذرنے پر یہ قوانین اسلامی احکام کے متعارض ہونے کی حد تک لازماً منسوخ ہو جائیں گے اور

(ب) اسلامی احکام کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کرے، جس سے نیشنل اور صوبائی اسمبلیاں آئندہ قانون سازی میں مدد لے سکیں۔ یہ کمیشن ہر سال ایک رپورٹ پیش کرتا رہے گا اور اپنے تقرر کے بعد پانچ سال کے اندر

اپنا کام مکمل کر دے گا۔ کمیشن کی سالانہ رپورٹیں وصول ہونے کے چھ مہینے کے اندر نیشنل اسمبلی میں پیش کی جاتی رہیں گی اور اسمبلی ان پر غور کر کے شق (۲) اور (۳) پر عمل درآمد کرنے کے لیے قوانین بناتی رہے گی۔

۱۸۔ سابقہ رپورٹ کے مطابق صدر مملکت، مسلم وزیر اعظم، مسلم وزراء، مرکزی و صوبائی مسلم گورنر، مسلم وزیر اعلیٰ اور مسلم ارکانِ مرکزی و صوبائی اسمبلی کے حلف نامے میں یہ جملہ بھی شامل کیا جائے کہ "میں اپنی نجی اور سرکاری زندگی میں اسلام کے عائد کردہ فرائض اور واجبات کی تعمیل کی پوری کوشش کروں گا۔"

آخری اپیل

مذکورہ بالا ترمیمات پیش کرتے ہوئے ان نمائندہ جماعتوں کی طرف سے اربابِ اقتدار اور ارکانِ دستوریہ سے حسب ذیل متفقہ اپیل کی گئی ہے۔

"اس بات کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہ نو سال کی طویل مدت میں دستور سے محرومی کے باعث ہمارا ملک جس خطرناک خلفشار میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اور جس طرح بیرونی دنیا میں اس کا وقار مجروح ہوا ہے، وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ بلا کسی تاخیر کے دستور مرتب ہو۔ نیز اس بات کا بھی پورا احساس رکھتے ہوئے کہ بعض عناصر کی طرف سے مرکز کو کمزور تر کرنے، ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے، اسے تحریک پاکستان کے بنیادی مقاصد و نظریات سے محروم کرنے اور ملت مسلمہ کی وحدت و سالمیت کو ختم کر کے، ہندو مسلم قومیت کا کانگریسی جال دوبارہ بچھانے اور مخلوط انتخابات رائج کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اقتدار کی اندھی جنگ نے بعض

ایسے آدمیوں کو بھی اس صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے جن سے کسی حد تک اندیشہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ ہمارا خیال ہے کہ مسودہ دستور میں جو اہم خامیاں جمہوری اور اسلامی نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہیں۔ ان کی جانب دستور سازوں کو پوری دلسوزی کے ساتھ متوجہ نہ کرنا اور ان کو دور کرنے کی ممکن آئینی کوشش سے گریز کرنا بھی ملک و ملت کے ساتھ خیانت ہوگی۔ کیونکہ ملک کی آئندہ نشوونما ہی نہیں بلکہ اس کی بقا و سالمیت پر بھی اس دستور کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔

دستور مملکت کسی ملک کا بھی ہو۔ اس ملک کی اہم قومی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اثرات زندگی کے ہر گوشہ پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہذا ہم متفقہ ترمیمات پیش کرتے ہوئے دستور سازوں سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ جن خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ انہیں دور کر کے جلد از جلد دستور کی تکمیل کریں اور یوم قرارداد پاکستان یعنی آئندہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے دستور کے نفاذ کا اعلان کر دیں اور اس کے بعد جلد از جلد عام انتخابات کرائیں۔

ساعتِ سعید

پورے ساڑھے آٹھ سال گذرنے کے بعد ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو رات کے ٹھیک گیارہ بج کر انسٹھ منٹ پر دستور ساز اسمبلی نے آئینی بل اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں منظور کر لیا۔ اور اس طرح پاکستان کے مخلص ترین وزیر اعظم چودھری محمد علی صاحب نے فروری کے آخر تک قوم کو نئے آئین کی جو پیش کش کا وعدہ کیا تھا، وہ ان کے اخلاص کی بدولت

بفضلہ تعالیٰ پورا ہو گیا۔

اربابِ غرض کا احتجاج اس اسلامی آئین کی منظوری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے حزب اختلاف کے ارکان مسٹر حسین شہید سہروردی کی زیر قیادت اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ واک آؤٹ کرنے والے ۲۱ ارکان میں ۱۲ عوامی لیگ اور ۴ کانگرس پارٹی کے ارکان کے علاوہ مسٹر محمود علی (گنا تنتری دل) ڈاکٹر سین (پروگریسو پارٹی) میاں افتخار الدین اور اچھوت فیڈریشن کے دو ارکان شامل تھے۔ البتہ موخر الذکر دونوں پارٹیوں کے ممبر جو وزیر صحت اور وزیر مملکت تھے، واک آؤٹ کرنے والوں میں شامل نہ تھے۔ اس آئین کی حمایت میں جن علماء کرام نے جد و جہد کی، انہوں عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی نے علماء سوء کا خطاب دیا۔ کیونکہ وہ مسٹر حسین شہید سہروردی کے غیر اسلامی نظریات کی پورے زور سے اخیر وقت تک مخالفت کرتے رہے اور مسٹر حسین شہید سہروردی نے نئے آئین کی تکمیل کے سلسلہ میں کوئی تعمیری حصہ اس لیے نہ لیا کہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان کے سپرد کرنے کے وعدہ کو پورا نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ مسودہ دستور کا بڑا حصہ خود مسٹر سہروردی کا مرتب کردہ تھا۔ اگر بعد میں وزارت کے مسئلہ پر اختلاف پیدا نہ ہوتا، تو مسٹر اسماعیل چندریگر کی جگہ خود مسٹر سہروردی دستور میں نیا آئین پیش کرتے۔ اس طرح وہ نہ صرف اس شرف سے محروم رہے بلکہ مسودہ دستور کی بعض ایسی دفعات کی بھی انہیں مخالفت کرنی پڑی جو خود ان کی اپنی مرتب کردہ تھیں۔

مولوی کا کارنامہ بخلاف اس کے یعنی حزب اختلاف کی انتہائی مخالفت کے باوجود موجودہ دستور اگر منظور ہو سکا، تو وہ صرف ایک

دلوی کی وجہ سے، جنہیں ملک کا مقتدر اور ذمہ دار اخبار "نوائے وقت" لاہور اختلاف رکھنے کے باوجود، ان الفاظ میں، اپنے اداریہ میں، خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا کہ:۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ پوری قوم نئے آئین کی تکمیل کے لیے مبارک باد کی مستحق ہے۔ پاکستان کو نیا آئین آٹھ برس کے طویل انتظار کے بعد مل رہا ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلہ میں جو مساعی ہوئیں، وہ کسی نہ کسی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گئیں۔ اس آخری کوشش کے دوران میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید نیا آئین اس مرتبہ بھی مکمل نہ ہو سکے مگر خلوص و استقلال کو مزاحمت و مخالفت پر فتح حاصل ہوئی اور بالآخر دستور ساز اسمبلی نے اپنی مہر تصدیق مسودہ دستور پر ثبت کر ہی دی۔ اس سلسلہ میں مسٹر محمد علی نے جس خلوص اور عزم مصمم کا مظاہرہ کیا، وہ بلاشبہ داد کے قابل ہے۔ کوئی نبتاً کم حوصلہ شخص ہوتا، تو ہمت ہار کر راہ میں ہی بیٹھ جاتا۔ کیونکہ قدم قدم پر سخت موانع تھے۔ مغربی پاکستان میں وزیر اعظم کے رفقا مسٹر مشتاق احمد گورمانی اور وزیر قانون مسٹر چندریگر نے نئے دستور کی منظوری کے سلسلہ میں جو کام کیا، اس کا اعتراف تو کیا ہی جائے گا۔ لیکن مسٹر فضل حق کے تعاون کا تشکر آمیز اعتراف نہ کرنا ناقابل معافی بخل میں شامل ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ دباؤ مسٹر فضل حق پر تھا اور انہیں کولیشن پارٹی سے توڑنے اور نئے دستور کی منظوری کو ناممکن بنانے کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں اور بعض اوقات تو یوں نظر آتا تھا کہ یہ کوششیں کامیاب ہو جائیں گی۔ مگر مولوی صاحب

نے اس مرتبہ استقامت کا جو مظاہرہ کیا، وہ عام لوگوں کے لیے بڑی خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیا دستور مولوی فضل حق صاحب کی تائید و تعاون کے بغیر منظور نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ اگر وہ کسی مرحلہ پر پھسل جاتے، تو دستور ساز اسمبلی کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔"
(نوائے وقت ۲؍ مارچ ۱۹۵۶ء)

قدرت کی ستم ظریفی

ابتداء میں میجر جنرل سکندر مرزا اسلامی آئین کے قائل نہ تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے اخبار "تنویر" لکھنؤ کے نامہ نگار کو جو بیان دیا تھا، اس پر ہندو پاکستان میں پُرزور احتجاج کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۵ء میں فخر العلماء حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں ایک عشائیہ کی تقریب پر حسنِ اتفاق سے ان کی میجر جنرل سکندر مرزا سے ملاقات ہوگئی۔ میجر صاحب نے اسلامی آئین کے بارہ میں چند اشکالات حضرت قاری صاحب کے سامنے پیش کیے۔ تو انہوں نے ان کے اشکالات کا ایسا کافی، وافی، مدلل اور مؤثر جواب دیا کہ میجر صاحب بیتابا کہہ اٹھے کہ اگر واقعی اسلام کے بنیادی اصول یہی ہیں، تو ہم انہیں ہر قیمت پر منظور اور نافذ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ قرآن کی رُو سے اسلامی دستور صرف ۱۷-۱۸ دفعات پر مشتمل ہے۔ باقی سب بائیلاز یا رولز ہیں، جن کو لوگ غلط فہمی سے اسلامی آئین سمجھ رہے ہیں۔ اس پر میجر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ منسوخ کر کے یہاں رہیں اور اسلامی آئین مرتب کرنے میں ہماری مدد کریں۔ مگر دارالعلوم کی ذمہ داریوں کی وجہ سے قاری

صاحب میجر صاحب کے اصرار کے باوجود یہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور فرمایا یہاں اس سلسلہ میں اعانت کے لیے دوسرے حضرات موجود ہیں۔ بہر حال فخر العلماء حضرت قاری صاحب کی ایک ہی ملاقات نے اس اہم مسئلہ کے متعلق میجر صاحب کی تمام غلط فہمیاں دور کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میجر صاحب جو پہلے اسلامی دستور کے قائل ہی نہ تھے، اسلامی دستور جلد از جلد پاس کرانے میں بڑی دلچسپی لیتے رہے۔ اور بالآخر مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو انہوں نے ایک شاندار اور پروقار تقریب میں اسمبلی ہال پر اپنے دستخط اور مہر تصدیق ثبت کر کے اسے قانونی شکل دے دی اور میجر صاحب کی شاندار خدمات پاکستان کے اعتراف کے طور پر انہیں بلا مقابلہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

شرف و سعادت

اسلامی آئین کے سلسلہ میں جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے پہلے صدر میجر جنرل سکندر مرزا کی غلط فہمی دور کرنے کی سعادت بھی دربار اشرفیہ کے ایک خادم اور حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو ہی نصیب ہوئی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ بعد قیام پاکستان حضرت تھانوی کے فیض سے اب تک پاکستان اور ارباب پاکستان فیض یاب ہو رہے ہیں اور جناب سکندر مرزا صاحب بھی مستحق تحسین ہیں کہ انہوں نے صحیح بات سمجھ میں آجانے کے بعد بلا تامل اپنا نظریہ بدل لیا۔ جو ان کی سلیم الفطرتی پر دال ہے۔ اسی لیے حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی خوانوں کی گفتگو میں مزہ آتا ہے کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے بات مان لیتے

ہیں۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۳۹)

مفتی اعظم کا پیغام

اسلامی آئین کی منظوری کے فوراً بعد ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان و قائم مقام صدر جمعیۃ علماء اسلام نے ریڈیو پاکستان کراچی سے مندرجہ ذیل تقریر نشر کی:

"پاکستان بنے ہوئے تقریباً نو سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں اس نومولود مملکت نے اپنے تعمیری منصوبوں کے بہت سے شعبوں میں ایک حد تک ترقی بھی کی۔ لیکن ایک بنیادی خلا ایسا تھا، جو اس ملک کو طرح طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بنائے ہوئے تھا اور بیرونی دنیا میں ہمارا وزن بہت ہلکا کیے ہوئے تھا۔

دستور سازی میں اتنی طویل مدت کیوں صرف ہوئی؟ یہ ایک ایسی داستان ہے، جسے دہرانا لاحاصل ہے۔ بہرحال ہر چیز کا ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ اللہ جل و شانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج وہ یوم سعید بھی آپہنچا کہ سالہا سال سے اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا یہ سفینہ نہ صرف گرداب سے باہر نکل آیا بلکہ ساحل مراد تک جا پہنچا۔ پاکستان کے لوگ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے کہ اس کے فضل و کرم سے اس ملک کو طویل انتظار کے بعد ایسا دستور میسر آیا، جسے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "اس میں قیام پاکستان کے بنیادی مقاصد، عامۃ المسلمین کی آرزوؤں اور اسلام کے اہم تقاضوں

کی خاص رعایت موجود ہے"۔

خامیوں سے پاک تو انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فی الجملہ ایسا دستور حاصل ہو گیا جس سے ہماری تعمیری سرگرمیوں کا ایک صحیح رُخ متعین ہو جاتا ہے اور اگر ہماری قوم کے مختلف عناصر بیداری اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض کی جانب متوجہ ہوئے، تو انشاء اللہ وہ دن دور نہیں کہ پاکستان فوز و سعادت کی جانب اس تیز رفتاری سے گامزن ہو گا کہ دیکھنے والے ہتحیر رہ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ عوام اور خواص سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ان ذمہ داریوں کو محسوس کریں، جو آج کے دن بالخصوص عائد ہوتی ہیں۔ اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق استوار کرنے کی سعی کریں۔

پاکستان کا وجود اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے اور اس کا یہ دستور ایک مستقل انعام۔ ہم سب کو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ارکان دستور یہ خصوصاً وزیر اعظم جن کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں کے نتیجہ میں یہ دستور مکمل ہوا۔ وہ مستحق شکر اور لائق تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو دنیا و آخرت میں جزاء خیر عطا فرمائیں اور اس کی توفیق دیں کہ دستور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس سرگرمی کے ساتھ کام کر سکیں جس انہماک کے ساتھ گذشتہ

چند ماہ کے دوران دستور کی ترتیب کا کام انجام دیا گیا ہے "۔

حسنِ اتفاق آئین کی منظوری کے بعد پاکستان کو آزاد خود مختار جمہوریہ قرار دینے کی تجویز ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء مقرر کی گئی کیونکہ اسی روز لاہور کے تاریخی اجلاس میں مولوی فضل حق مرکزی وزیر داخلہ نے قرارداد پاکستان پیش کی تھی اور اب ۲۳ مارچ کے دن کو یوم جمہوریہ قرار دینے اور اسی دن ہر سال یوم جمہوریہ منانے کی نسبت قرارداد بھی ۸۶ سالہ مولوی فضل حق نے دستوریہ میں پیش کر کے منظور کرائی۔ مولوی فضل حق نے اپنی بھاری اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ یوم جمہوریہ کی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا :۔

"یہ میری خوش بختی ہے کہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم نے مجھے قرار داد پاکستان پیش کرنے کیلئے بلایا تھا - آج میں دُنیا کی عظیم ترین مملکت ____ مملکتِ پاکستان کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا یہ شاندار ثمر دیکھ کر اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھ سکتا۔"

(نوائے وقت ۲۴ر مارچ ۱۹۵۶ء)

واقعاتی فیصلہ پیش کردہ واقعات اس امر کے غماز ہیں کہ :۔

الف : ملک میں صحیح معنوں میں علماء کرام ہی عوام کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

ب ۔ علماء کرام کے پیش نظر ذاتی مفاد نہیں تھا، بلکہ وہ ملّتِ مسلمہ کی وحدت اور مملکتِ پاکستان کی سالمیت کے لیے مصروف جدوجہد تھے۔

ج ۔ مگر لیڈرانِ قوم کے سامنے ذاتی اور جماعتی مفاد تھا - وہ دستور آئینہ والی

نسلوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفاد کے لیے مرتب کرنا چاہتے تھے۔

د - جس کی علماء کرام پوری ہمت و قوت کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے اور

ہ - اسی لیے یہ لوگ علماء کرام کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر بلطائف الحیل ہٹانا بلکہ مٹانا چاہتے تھے۔

مؤیدات پاکستان

جوازِ پاکستان

پاکستان ہندوستان کے مخصوص حالات اور مندرجہ ذیل بین الاقوامی قانون کے ماتحت معرضِ وجود میں آیا تھا۔

"گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ہی ایک ایسا اصول مرتب کر لیا گیا تھا جس کی بناد پر اقلیتوں کی دو قسمیں قرار دی تھیں۔ ایک وہ مستقل قوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری وہ جنہیں جماعت تحت القوم یا قوم اندر قوم کہنا چاہیے۔ اول الذکر کے لیے حق آزادی و خود مختیاری تسلیم کیا گیا اور موخر الذکر کو اس کا استحقاق دیا گیا کہ ان کے مذہب، زبان اور تہذیب کے تحفظ کی مکمل ضمانت کی جائے۔

یہ اصول موضوعہ جس تخیل پر وضع کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر کوئی اقلیت کسی ایسے علاقہ میں یک جا آباد ہے جس کی سرحدیں کافی واضح اور متعین ہیں اور اس کی جغرافیائی حدود میں مناسب ترمیم کر کے اس اقلیت کو معقول و موثر اکثریت میں بدلا جا سکتا ہے تو اسے آزاد اور خود مختیار ریاست بننے کا حق ملنا چاہیے۔" (پاکستان اینڈ مسلم انڈیا)

چیکوسلاویکیہ، فن لینڈ، استھونیا، لٹویا، لتھوانیا اور پولینڈ اسی اصول کی پیداوار تھیں۔ چونکہ یہ نئی تقسیم بالکل انصاف و دیانت پر مبنی تھی۔ اس لیے ان ممالک کے عدم سے وجود میں آنے پر کوئی ہنگامہ، کوئی فساد اور کوئی کشت و خون نہیں ہوا تھا۔

مخالفتِ پاکستان

مگر یہاں چونکہ مسلمان ایک ایسی قوم کے ساتھ مل کر رہ رہے تھے۔ جس کا مقصد حیات قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ :-

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا	کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر قابو پا دیں، تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں

اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک عرصۂ دراز سے مصروف جد و جہد تھے۔ اس لیے مطالبۂ پاکستان ان کے لیے سوہانِ روح ہو گیا۔ کیونکہ انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ پاکستان بن جانے سے ایک تو بھارت ماتا کے دونوں بازو کٹ جائیں گے۔ دوسرا جس مقصد کے لیے آزادی طلب کی جا رہی تھی، وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ یعنی ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان نہ مٹایا جا سکے گا۔ اس لیے قومیت متحدہ کے آتش فشاں کے جگر میں جو زہریلا مادہ اور آتشیں لاوا جوش مار رہا تھا۔ تحریکِ پاکستان سے اسے جلد نکلنے کے لیے ایک راستہ ہاتھ آ گیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر بقول سردار عبدالرب نشتر سابق وزیر صنعت پاکستان :-

"۵ لاکھ سے ۱۰ لاکھ مسلمانوں کی جانیں گئیں۔ نوّے ہزار مسلمان عورتیں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ اسّی لاکھ مسلمان اپنے مال و جائیداد

سے محروم ہو گئے" (تقریر ڈھاکہ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

اس مادہ کے جلد پھوٹ پڑنے سے بقول علامہ شبیر احمد عثمانی :-

"اس کی تباہ کاری ذرا محدود ہو کر رہ گئی اور اگر دو چار برس اور گزر جاتے اور پاکستان نہ بنتا، تو اس آتش فشاں کے بے طور اور وسیع پیمانہ پر پھٹنے سے پورے دس کروڑ مسلمان اس کی لپیٹ میں آجاتے"۔

(خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء اسلام کانفرنس۔ ڈھاکہ ۱۹۵۲ء)

کیونکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان، جو اگرچہ ملک کی کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ تھے، اس برِعظیم میں اس طرح بکھرے ہوئے اور منتشر حالت میں ایک زبردست اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے کہ ہندوؤں کے لیے اپنے تیار کردہ منصوبہ کے ماتحت ان دس کروڑ مسلمانوں کو ختم کرنا نہایت آسان تھا۔

رام راج کا منصوبہ

ہندوستان سے مسلمانوں کو ختم کرنے والا منصوبہ سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں یعنی آج سے تیس برس پہلے سوامی ستیہ دیو پری پراچک کی زبانی منظر عام پر آیا تھا۔ جب کہ انہوں نے ساگر (متوسط ہند) میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ :-

"ہندو! سنگھٹن کرو۔ مضبوط بنو۔ اس دنیا میں طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے اور جب تم مضبوط بن جاؤ گے، تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گے۔ اس صورت میں ہم خود ان کے سامنے اپنی یہ شرطیں پیش کریں گے :-

۱- قرآن کو الہامی کتاب نہ سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسولِ خدا نہ کہنا چاہیے
۳۔ عرب وغیرہ کا خیال دل سے دور کر دینا چاہیے۔
۴۔ سعدی و رومی کی بجائے کبیر و تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔
۵۔ اسلامی تیوہاروں اور تعطیلوں کی بجائے ہندو تیوہار و تعطیلات منائی جائیں۔
۶۔ مسلمانوں کو رام اور کرشن وغیرہ دیوتاؤں کے تیوہار منانے چاہئیں
۷۔ انہیں اسلامی نام بھی چھوڑنے چاہئیں۔
۸۔ عربی کی بجائے تمام عبادتیں ہندی میں کی جائیں۔

(اخبار وکیل امرتسر ۹ ردسمبر ۲۵ء صہ)

دستورِ جہانبانی

غیر مسلم حکمرانوں کا عام طور پر یہ دستور رہا ہے کہ وہ دوسرے کے ملک پر قبضہ و تسلط جمانے کے بعد سب سے پہلے ان کی تہذیب و تمدن کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہایت معصومانہ انداز میں ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس ملک کے باشندے خود بخود حکمران طبقہ کی تہذیب و تمدن اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ حملہ بالعموم تعلیم و تربیت کی راہ سے کیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ عوام و خواص کے ذہن میں اپنی تہذیب کی اچھائیاں اور سابقہ تہذیب کی برائیاں نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جس کی زندہ مثال ہمارے سامنے انگریزوں کی موجود ہے۔ انہوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے یہاں کے حکمران طبقہ یعنی مسلمانوں کی

سیرت بدلنے کے لیے ان کا وہ اخلاقی نصاب، جو کریما سے شروع ہو کر گلستاں تک چلا جاتا تھا اور جس کے اسباق ہر عمر میں پڑھنے والے کے کام آتے تھے، یکسر بدل دیا اور اس کی جگہ کتے اور بلیوں کی کہانیوں کا ایک ایسا نصاب مقرر کیا، جس سے بقول مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی :۔

"طفلانہ دلچسپیوں کے سوا کوئی اخلاقی تعمیر، سیرت کا فائدہ اور زندگی کا قاعدہ معلوم نہ ہوا"
(داستانِ عمل صہ۳۱)

بلکہ اس سے مسلمان اپنی تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت کو ذلیل اور حکمران طبقہ کی تہذیب و تمدن و معاشرت کو معزز سمجھنے لگا۔ جیسے اس نے آج تک اختیار کیا ہوا ہے۔

چنانچہ ہندوؤں نے بھی اپنے مذکور الصدر منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالتے ہی، انگریزوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سب سے پہلے وہاں کا نصاب تعلیم بدلنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ملک کی مقبول ترین زبان اُردو کی بجائے ہندی کو قانوناً ذریعہ تعلیم بنایا۔ جس کے بولنے اور سمجھنے والے ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھے۔

مقامِ اُردو اُردو جسے ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ جو قریباً ہر بڑے ملک کی یونیورسٹیوں میں باہتمام پڑھائی جاتی ہے۔ جس میں قریباً دنیا کے ہر بڑے ریڈیو سٹیشن سے روزانہ پروگرام نشر ہوتے ہیں اور الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج بابو شیو پرشاد سہنا کے قول کے مطابق :۔

"دنیا کی کوئی زبان نفاست و شائستگی میں اُردو اور فارسی کا مقابلہ نہیں کر سکتی"۔

اُردو زبان دنیا میں تیسرے نمبر پر بولی جاتی ہے ۔ جیسا کہ اقوام متحدہ کے تعلیمی اور ثقافتی ادارہ (یونسکو) کا ماہنامہ "کوائر" لکھتا ہے کہ :۔

"اس وقت دُنیا میں تین ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ دُنیا کی تیرہ سب سے بڑی زبانوں میں چینی اور انگریزی کے بعد سب سے بڑی آبادی اردو بولنے والوں کی ہے ۔ روسی، ہسپانوی، جرمن، جاپانی اور فرنچ کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔"

لیکن حکومتِ ہند کی طرف سے بمقدمہ انجمن ترقی بنام بنارس میونسپل بورڈ کلکٹر بنارس نے جو جواب دعویٰ عدالت میں داخل کیا ہے ۔ اس میں دنیا کو دھوکا دینے کی غرض سے یہ درج کیا گیا ہے کہ :۔

"اُردو کوئی زبان نہیں ہے" (قومی آواز ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ع قیاس کُن ز گلستانِ من بہارِ مرا

جبڑا توڑ ہندی

اُردو کے وجود سے اس طرح انکار کرنے کے بعد وہاں ایک ایسی جناتی زبان مروج کرنے کے لیے تمام سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مصروفِ عمل ہیں جن کے متعلق خود ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ :۔

"اس وقت تک جو ہندی سرکاری دفتروں میں چلائی گئی ہے وہ توڑے جبڑا توڑ الفاظ کا مجموعہ ہے ۔ اس طرح کی ہندی کبھی بھی عامۃ الناس کی ہندی نہیں بن سکتی ۔ میں نے تو جب سرکاری استعمال کے لیے اس قسم کی لغت پر نظر ڈالی، میرے سر میں درد ہونے لگا۔"

(صدق جدید ۱۹ر جنوری ۱۹۵۴ء)

اُردو تو ہندوستان کا بچّہ بچّہ بول اور سمجھ سکتا ہے ۔ مگر ہندی وہاں کے عوام تو کیا خواص بھی نہیں سمجھ سکتے ۔ اسی لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے یو، پی پولٹیکل کانفرنس باندا میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

"میں آپ کے استقبالی صدر کا خطبہ پڑھ رہا تھا، جو ٹھیٹھ ہندی میں ہے۔ میں اس کا پچاس فیصدی حصّہ نہیں سمجھ سکا ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جلسہ میں اور لوگ جو شریک ہیں، ان کی سمجھ میں اس کا کتنا حصّہ آیا ہے "۔

(صدق جدید ۱۹ر اپریل ۱۹۵۴ء)

سیاسی مسئلہ ہندوستان میں ہندی کی ترویج کے لیے جو سردھڑ کی بازی لگائی جارہی ہے ۔ اس کی وجہ لسانی نہیں بلکہ سیاسی ہے ۔ اگر نیک نیّتی کے ساتھ وہاں ہندی کو لسانی حیثیت سے بتدریج رواج دیا جاتا تو آخر لوگ رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہو جاتے ۔ مگر اسے فوراً اور بہ جبر رائج کرنے کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی کہ :۔

ا : ہندو اُردو کو مسلم تہذیب و تمدن کا نشان سمجھتے تھے ۔

ب : زیادہ تر اسلامی لٹریچر اسی زبان میں موجود تھا ۔

ج : اُردو کو زندہ رکھنے کی صورت میں مسلمانوں کو شدھ کرنے کا پروگرام بآسانی نہیں چل سکتا تھا ۔

اس لیے ہندوؤں نے ہندی کو لسانی مسئلہ کی بجائے سیاسی مسئلہ بنا لیا ۔ جس کا راج رشی بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے اواخر ۱۹۵۴ء میں الہ آباد کی بین الصوبائی ہندی

کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے یوں اعتراف کیا کہ :-

"ہندی کا سوال اب بھی ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اس میں ہوشیار رہنا چاہیئے کہ جس پوزیشن میں ہندی کو پہنچایا جا چکا ہے، اس سے اس کو علیحدہ نہ کیا جائے۔" (ہماری آواز)

اُردو کشی کی مہم

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندی کو کیسے، کہاں سے کہاں تک پہنچایا گیا؟ اس مہم کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے کر قانوناً ملک میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس سے اسے نام نہاد سیکولر گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے نہایت معصومانہ انداز میں ۱۲ر نومبر ۱۹۵۲ء کو الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسہ میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ :-

"ہندی کی آئندہ ترقی اور نشو ونما کا انحصار بہت کچھ تو اس پر ہے کہ غیر ہندی داں (مسلمان) اس کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ دستور میں جو دفعات ہندی سے متعلق رکھی گئی ہیں۔ ان پر عملدرآمد صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہندی نہ بولنے والے (مسلمان) بھی اسے اپنا لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ رواداری اور فراخ دلی سے کام لیں اور ہندی زبان کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ دوسری علاقائی زبانوں سے آئی ہوئی چیزوں کو جذب کر سکے۔ ہندی کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں تبدیلیاں برابر ہوتی رہی ہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ یہ تبدیلیاں علاقائی زبان کی مدد سے کی جائیں گی"۔

(صدق جدید۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۵۲ء)

کایا پلٹ اس طرح صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے مسلمانوں کو اُردو کی بجائے ہندی قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ حکومت کی اس حوصلہ افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندوؤں نے ہندی کی ترویج کو ایک قومی مسئلہ بنا لیا اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اسے تمام ملک میں فی الفور جگہ دینے اور اُردو کو حرف غلط کی طرح مٹانے پر کمربستہ ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں قاضی محمد عدیل عباسی ایم۔ ایل، اے، صدر استقبالیہ اُردو کانفرنس بستی کا بیان ہے کہ:۔

"اُردو زبان کے ساتھ ایک بدیشی زبان سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری محکمے میں بطور زبان تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ کچہریوں کا یہ حال ہے کہ وہاں اُردو کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ اُردو کے دستاویزات کی نقل اردو رسم الخط میں نہیں ملتی اور جو کاغذات اُردو میں ہوں، ان کا ہندی ترجمہ عدالتوں میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ اگر ترجمہ نہ دیا جائے، تو وہ کاغذ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور پڑھا ہی نہیں جاتا۔ سرکاری دفاتر اور گورنمنٹ کے گزٹ میں جو اشتہارات، نوٹس اور اعلانات پبلک کی اطلاع کے لیے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اُردو میں نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ نشاناتِ راہ اور سڑک پر میلوں کے پتھر پر بھی اُردو کو جگہ نہیں دی گئی۔ لکھنؤ جیسے شہر میں اسٹیشنوں پر "اندر آنے کا راستہ" اور "باہر جانے کا راستہ" اُردو میں تحریر نہیں ہے اور ایسی کٹھن بھاشا میں درج ہے کہ ان کا سمجھنا اُن لوگوں کے لیے بھی مشکل ہے، جو اسے پڑھ لیتے ہیں ٹکٹ خریدنے کی جگہ پر بھی اُردو زبان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سب سے بڑا

ظلم یہ ہے کہ بچوں کو اُردو پڑھنے کی اجازت نہیں"

(صدق جدید ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء)

اور "سیاست جدید" کانپور (جون ۵۴ء) کی اطلاع کے مطابق :۔

"سارے ہندوستان میں کسی ایک ریلوے لائن پر بھی ٹکٹوں پر اُردو باقی نہیں"۔
یہاں تک کہ اسٹیشنوں کے اُردو نام بھی مٹا کر ہندی میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ غرضیکہ وہاں کے ہر دفتر، ہر محکمہ، ہر ادارہ اور ہر معاملہ میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ہندی سیکھنے کے سوا روزمرہ کی گاڑی کو چلانا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

اشک شوئی

پنڈت نہرو نے مسلمانوں کو ظاہری طور پر خوش رکھنے کے لیے بارہا اُردو کو نقصان پہنچانے کے لیے فرقہ پرست ہندوؤں کی کوششوں کی مذمت کی ہے۔ بلکہ امرتسر میں کانگرس کے اکسٹھویں ۱۹۵۶ء اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

میرے لیے یہ بات باعثِ شرم ہے کہ ایسی کوششیں خود میرے صوبہ میں بھی جاری ہیں"

مگر ان کی حکومت نے ان ناپاک کوششوں کو ختم کرنے کے لیے آج تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ بلکہ ۱۹۵۳ء میں اُردو کو یو، پی کی علاقائی زبان قرار دینے کے مطالبہ کی حمایت میں بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ صدر بھارت کو جو یادداشت روانہ کی گئی تھی، اس کے متعلق دو سال ختم ہو جانے کے باوجود ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ صدر ان امور کے بارہ میں کابینہ کے مشورے کے پابند ہوتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پنڈت نہرو محض مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں یا اس معاملہ میں ان کی حکومت فرقہ پرستوں کے آگے بالکل بے بس اور مجبور محض ہے۔

بنیادی نصاب

اگر ہندی پڑھنے پڑھانے کا معاملہ صرف ایک نئی زبان سیکھنے کی حد تک محدود رہتا، تو اسے طوعاً و کرہاً برداشت کیا جا سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ پیدا کر دی گئی کہ ہندی کو صرف اردو کشی کا ہی ذریعہ نہ بنایا گیا، بلکہ اس سے نہایت خاموشی کے ساتھ تدریجاً مسلمانوں کو شدھ کرنے کا کام بھی لیا جانے لگا۔ یعنی سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں سے اردو کو بیک بینی دو گوش نکال کر اس کی جگہ ہندی کے ایسے بنیادی نصاب مقرر کیے گئے جن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلمان خود بخود ہندو ہو جائیں اور بمصداق نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے، ایک تیر سے دو شکار ہونے لگیں ——— !

ابتدائی تعلیم

ہندوستان میں اس وقت جس قسم کی ابتدائی تعلیم مسلمان بچوں کو دی جا رہی ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے، مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ایڈیٹر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ نے تعلیمی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ :-

"ابتدائی تعلیم تمام تر ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کی ترجمان ہے اور اس کی مبلغ ہے۔ جس میں اسلامی تہذیب اور روایات کا کوئی شائبہ نہیں۔ اس کی کتابوں میں دیومالا کی خرافیات اور علم الاصنام کے مشرکانہ ادہام تک ہیں، جو اسلامی تعلیم کے سراسر منافی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب

کا سوال الگ رہا، ان کی تاریخ، تہذیب تک کا اس میں کوئی نشان نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ جنگِ آزادی کے ان مسلمان مجاہدین اور رہنماؤں تک کے ذکر سے یہ کتابیں خالی ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کو آزادی کا سبق پڑھایا۔ ایسی حالت میں جو مسلمان بچے پڑھیں گے، ان کا انجام اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ اپنے مذہب تہذیب اور روایات سے بالکل بے گانہ ہوں گے اور ہندو تہذیب کے رنگ میں بالکل رنگ جائیں گے اور آئندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی"

(صدق جدید ۱۰ر جون ۱۹۵۵ء)

اس کی مزید تائید و تصدیق مدراس کے "دکن ہیرلڈ" میں شائع ہونے والے ایک مراسلہ سے ہوتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ:-

"یوپی کے محکمہ تعلیمات نے اردو کی جو بیسک ریڈریں تیار کرائی ہیں، وہ صاف شدھی کا پروپاگنڈا اور ہندو دھرم کے پرچار کا ایک آلہ ہیں۔ ۱۲ سبقوں کو چھوڑ کر جو قواعد زبان سے متعلق ہیں، باقی ۸ میں سے بڑی کثرت سے سبق ہندوانہ ہی ہیں۔ جہاں تک ہندو بزرگوں اور رسموں اور تیرتھوں کا تعلق ہے سبق شری رام چندر جی، بھرت ملاپ، شری کرشن جی، دھنش یگ۔ گنیش جی دسہرا، پرہلاد، رامائن، سگریو، گنگا، اجودھیا، متھرا، کاشی، پریاگ، سورداس، تلسی داس، میرا بائی وغیرہ سب پر ملتے ہیں اور کوئی ایک سبق بھی حضرت محمدؐ۔ حضرت مسیحؑ، خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ گورونانک وغیرہ پر موجود نہیں۔ اسی طرح ہندو لیڈروں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو ایشور چندر، ودیا ساگر، مدن موہن مالوی، تلک، لالہ لاجپت رائے

سردار پٹیل، راجندر پرشاد، سروجنی نیڈو، پنڈت پنت، ٹنڈن جی وغیرہ سب کا ذکر موجود ہے۔ لیکن نہیں ذکر آنے پایا ہے، تو حکیم اجمل خاں، سرسید، اقبال، آصف علی، محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسین احمد، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سید محمود کا۔ اس طرح جنگِ آزادی کے سلسلے میں کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ صرف منگل۔ پانڈے۔ نانا نبیا توپی اور بھگت سنگھ وغیرہ کے اور نام بھی نہیں آنے پایا ہے تو ٹیپو سلطان، سید احمد شہید، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کا۔" (صدق جدید ۴ مارچ ۱۹۵۹ء)

ثانوی تعلیم مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری یو، پی لکھتے ہیں کہ:۔

" پرائمری اسکولوں کے نصاب کے بعد ذرا جونیئر ہائی سکولوں کے نصاب پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔ پورے نصاب دیکھنے کی آپ کو زحمت کہاں تک دی جائے، بس نصاب کی ایک کتاب " ہمارے پوروج " یعنی " ہمارے پرانے بزرگ " کے چند اقتباسات اور اس کے مضامین کے چند عنوانات پیش ہیں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں جو ششم، ہفتم اور ہشتم کے لیے تیار کیے گئے ہیں اگر یہ کتاب ہندوؤں کی مذہبی تاریخ اور ہندوؤں کے مذہبی اسلاف کے تذکرہ کی حیثیت سے پڑھائی جاتی، تو کچھ زیادہ اعتراض کی بات نہ تھی کیونکہ بھارت کے مختلف فرقوں کے لڑکے اس نقطہ نظر سے یہ کتابیں پڑھتے اور ان سے ہندو دھرم، ہندو سنسکرتی اوتاروں، دیویوں، رشیوں، منیوں کی بابت انہیں کافی دلچسپ معلومات حاصل ہو جاتیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ یہ

کتاب ہندو دھرم کے پیشواؤں کی تاریخ کی حیثیت سے نہیں پڑھائی جا رہی ہے - بلکہ اس کا نام "ہمارے پوروج" ہے، جو مسلمان، سکھ، عیسائی ہر فرقہ کے بچوں کو اس کے دعوے کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے کہ:-

"یہ بھی جاننا چاہیے کہ یہ ہمارے پوروج (بزرگ) ہندوؤں ہی کے نہیں مسلمان، سکھ، عیسائی جو بھارت کے رہنے والے ہیں ان سبھی کے ہیں"۔

ذرا ٹھہریئے! بات ابھی ختم نہیں ہوئی - آگے کے دو فقرے اور پڑھ لیجیے کہ:-

"ہم ایسے پوروجوں کو بھول نہیں سکتے - ہم ان کا آدر کرتے ہیں، ان کی پوجا کرتے ہیں"۔

پہلے حصہ کا ٹائٹیل

جن پوروجوں کی "پوجا" کی طرف بچوں کی توجہ دلائی گئی ہے، ان کے مفصل تذکرے تو کتاب میں ہیں لیکن ٹائٹیل ہی پر بذریعہ تصاویر انہیں چند کا تعارف کرا دیا گیا ہے - تصویریں حسب ذیل ہیں - (۱) وسط میں برگد کا ایک درخت ہے - اس کے پاس ایک کھٹی بنی ہوئی ہے - برگد کی جڑ میں "پوروج" غالباً بالمیک جی تشریف فرما ہیں - ان کے سامنے دو لڑکے غالباً لو اور کش (رامچندر جی کے دو صاحبزادے) ہاتھ جوڑے ہیں - (۲) برگد کے دائیں طرف مہاتما گوتم بدھ (۳) سیتا جی (۴) گورو گوبند جی (۵) شیوا جی برگد کے بائیں طرف (۶) سری کرشن جی (۷) سری رام چندر جی (۸) دو ھیچ جی (۹) مہارانہ پرتاب سنگھ -

چند عنوانات

پہلا بھاگ اور اس کے چند عنوانات یہ ہیں:-

۱- مندھاتا - ویدک عہد کے ایک راجہ تھے، جن کے اختیار

میں تھا کہ جب چاہیں تپ اور ریاضت کر کے پانی برسا دیں۔

۲۔ گارگو۔ یہ ایک بڑی علامہ خاتون تھیں، جنہوں نے راجہ جنک کے یگیہ میں تمام پنڈتوں کو لاجواب کر دیا تھا۔

۳۔ دوسیچ۔ ویدک عہد کے ایک بڑے رشی جن کی خدمت میں اندر دیوتا برہمن کا روپ بدل کر امداد کے لیے حاضر ہوئے۔

۴۔ پرس رام۔ شیو جی کے ایک بڑے بھگت تھے۔

۵۔ کرن۔ کنتی جی کے پتر اور سورج دیوتا کے عطیہ تھے۔ بڑے ہو کر اتنے سخی اور فیاض ہوئے کہ رشی، منی، دیوتا، یہاں تک کہ بھگوان بھی بھکاری بن کر ان سے بھیک مانگنے آئے۔

۶۔ کرشن جی۔ یہ سب کی اتنی بھلائی کر گئے ہیں کہ لوگ انہیں بھگوان کہتے ہیں۔

۷۔ ارجن۔ مہابھارت کے مشہور ہیرو ہیں۔

۸۔ پار ڈینے۔ دریا کے بڑے عاشق تھے۔ تپ کر کے شنکر جی کو پرسن کیا تو شنکر جی نے تانڈو ناچ کے ذریعہ ڈمرو بجا بجا کر ان کو بہت سے علوم سکھائے۔ دیا کرن انہیں کی بنائی ہوئی ہے۔

۹۔ بدھ جی۔ کسی دین میں اتنا مہان منش پیدا نہیں ہوا۔ انہیں دیوتا مان کر لوگوں نے ان کی پوجا کی۔

دوسرے حصے کی تفصیل

"ہمارے پوروج" کے دوسرے بھاگ کے ٹائیٹل پر بالمیک جی کی تصویر ہے، جن کے سامنے ایک مرگ کھڑا ہے اور لو، کش ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ اس کے بعض عنوان یہ ہیں:-

۱۔ آپالا ۔ آپ کا بدن روگی تھا ۔ الاز دیوتا کی پوجا سے ان کا روگ دور ہوا۔

۲۔ دھرو جی ۔ بچپن ہی سے ایشور کے دیدار کے طالب تھے ۔ تپسیا میں برابر لگے رہتے تھے ۔ ایک بار نارو جی کو دیکھا، تو سمجھے یہی ایشور ہیں ۔ آخر میں اپنی مراد کو پہنچے ۔ سورگ میں سب سے اونچا درجہ پایا ۔ قطب شمالی میں دھرو جی کے روپ میں براجمان ہیں ۔

۳۔ جی ۔ بڑے ہی باکمال ایشور شکتیوں کے مالک تھے ۔ ایک بار برہما جی سے خفا ہو کر ارادہ کر لیا کہ نئی دنیا بنائیں ۔ چنانچہ انہوں نے پیڑ، پودے، پشو، پنکھی بنانا آرمبھ کیا ۔

۴۔ راجہ بھاگیرت ۔ راجہ سگر دیو کی دو رانیاں تھیں ۔ ایک رانی سے ان کے ساٹھ ہزار لڑکے تھے ۔ دوسری رانی سے ان کا صرف ایک صاحبزادہ تھا ۔ راجہ کے یگیہ کا ایک گھوڑا بھاگ کر ایک رشی کی عبادت گاہ میں پہنچ گیا، جو پاتال میں تھی ۔ راجہ کے لڑکے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وہاں پہنچے ۔ رشی کے ہاں گھوڑا پا کر انہیں پر چوری کا الزام لگایا ۔ رشی جی نے شراپ یعنی بددعا دی ۔ بس ساٹھ ہزار لڑکے فوراً بھسم ہو گئے ۔ اب ان کی راکھ بہانے کے لیے گنگا کی ضرورت تھی اور راجہ بھاگیرت کی کوششوں سے شیو جی کی جٹا سے نکل کر گنگا جی دھرتی پر آئی اور ان ۶۰ ہزار لڑکوں کا جل پرواہ ہوا ۔ گنگا کو بھاگیرتی بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ راجہ بھاگیرت کی کوششوں سے دنیا میں آئی ۔

۵۔ بالمیک جی ۔ رامائن کے مصنف ہیں ۔ انہیں کے ہاں سیتا جی اپنے دونوں لڑکوں لو اور کش کے ساتھ بن باس کے زمانہ میں رہی تھیں ۔

۶۔ سیتا جی ۔ رامائن کا مشہور واقعہ ۔

۷۔ ایک پودے ۔ تیر اندازی کا فن سیکھنے کے شائق تھے ۔ لیکن جب

ارجن جی کے گرو درونا چاریہ نے تعلیم سے انکار کر دیا، تو ایک پورے، درونا جی کی تصویر بنا کر پوجنے اور تیر اندازی کی مشق کرنے لگے۔ جس سے وہ اس فن میں طاق ہو گئے۔

۸۔ چانڑکے۔ موریہ بنس کے راجہ سے خفا ہو گئے اور چندر گپت کی حکومت قائم کی۔

۹۔ چندر گپت، بکرماجیت اور رامانج کے حالات زندگی۔

(صدق جدید ۵ نومبر ۱۹۵۴ء)

ہندی تعلیم کا اثر ایسی کتابوں کو پڑھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی نئی پود خود بخود شدھ ہو جائے گی اور "ہندی، ہندو، ہندوستان" کا نعرہ پرامن طریق سے کامیاب ہو جائے گا۔ گویا ہندوستان کا محکمہ تعلیم زبان کے ساتھ ساتھ شدھی کی تبلیغ کا فرض بھی ادا کر رہا ہے۔ اور اس نے ایسے طور طریقے اور نصاب و اسباق مقرر کر رکھے ہیں کہ سب کے سب ہندو مذہب کے پیرو ہو جائیں۔ چنانچہ حال ہی میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے اسلامی مذہبی ادارہ کے ایک ذمہ دار رکن نے ذکر کیا کہ "جب لڑکے سکول سے آتے ہیں تو گھر میں السلام علیکم کہنے کی بجائے نمستکار کرتے ہیں۔ جب کوئی چیز گم ہو جاتی ہے تو انا للہ پڑھنے کی بجائے سات مرتبہ رام رام پڑھتے ہیں اور اسی طرح ہر معاملہ میں ہندو تہذیب کی مطابقت کرتے ہیں۔ جب ان کو ٹوکا جاتا ہے کہ تم مسلمان ہو کر ایسا کیوں کرتے ہو، تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہمیں سکولوں میں یہی سکھایا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ڈرایا جاتا ہے کہ "اگر تم نے خلوت یا جلوت میں اس کے مطابق عمل نہ کیا اور اس کی ہم تک خبر پہنچ گئی، تو تمہیں سزا دی جائے گی۔ اب آپ ہی

بتائیں کہ ہم کیا کریں ؟" غرضیکہ اس طرح وہاں مسلمانوں کو شدھ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس کا بظاہر کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔

جبری ہندی تعلیم

اس سے بچنے کی ایک صورت یہ ممکن تھی کہ وہاں کے مسلمان اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا خود کوئی مناسب انتظام کرتے مگر وہاں ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ وہاں کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہر چھ سال کے بچے کے لیے سرکاری مدارس میں داخل ہونا لازمی ہے اور اگر والدین اس بارہ میں غفلت یا کوتاہی کریں، تو ان کے لیے دو سال تک کے لیے قید بامشقت موجود ہے۔ اس لیے وہاں کے ہر بچہ کو قانوناً ایسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے، جو اسے شدھ بنا دے۔ چونکہ شدھی کا کام محکمہ تعلیم کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس لیے محکمہ تعلیم کے کارکن مسلمان بچوں کی خاص طور پر تلاش میں رہتے ہیں، تاکہ کوئی مسلمان بچہ شدھ ہونے سے نہ بچ سکے۔

تبلیغ کی ممانعت

شدھی کے اس منصوبہ کو زیادہ کامیاب اور مؤثر بنانے کے لیے وہاں تبلیغ ممنوع قرار دی گئی ہے۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے سرکار ہند کے وزیر داخلہ ڈاکٹر کے، این، کاٹجو نے ۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء کو دار العوام میں مدھ ویش کے ایک ممبر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتلایا کہ:۔

> "ملک میں جتنے بھی غیر ملکی مشنری کام کر رہے ہیں، ان سب کو صفائی سے بتا دیا گیا ہے کہ اگر وہ سماجی رفاہ کے کام میں لگے ہوئے ہیں یا طبی تعلیمی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر انہوں نے مذہبی تبلیغ شروع کر دی، تو یہ پسندیدہ نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کے رویہ کی یہ بنیادی دفعہ

ہے۔" (صدقِ جدید یکم مئی ۱۹۵۳ء)

جب ملک کی بنیادی پالیسی کی رو سے ہندو دھرم کے سوا کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ ممنوع ہو، تو وہاں مسلمان اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے، جب کہ اسے شدھ بنانے کے لیے سرے سے اس کی تہذیب و تمدن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جا رہا ہو۔ جیسا کہ راج رشی ٹنڈن نے، پارلیمنٹ میں شبلی اکیڈیمی (جس کا نام شدھ کر کے شیو جی مہاراج کی نسبت سے شیولی اکیڈیمی رکھا گیا ہے) کی گرانٹ بند کر دینے کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کھلے لفظوں میں کہا کہ :۔

"میں نے شبلی اکیڈیمی کو امداد دینے کی مخالفت علیحدہ کلچر کی بناء پر کی تھی میری سمجھ میں ایرانی کلچر، عرب کلچر، چینی کلچر تو آتا ہے۔ لیکن میں ہندوستان میں سوائے ہندوستانی کلچر کے، کوئی دوسرا کلچر نہیں مان سکتا۔"

(صدقِ جدید ۱۴۔ مئی ۱۹۵۴ء)

مداخلت فی الدین

اسی لیے آئین ہند کے باب ۱۴ میں دفعہ ۴۴ رکھی گئی ہے۔ جس کا مقصد ہندوستان سے اسلامی کلچر کا نام ونشان مٹانا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"حکومت شہریوں کے لیے ایسے ضابطہ دیوانی کی کوشش کرے گی، جو سارے ملک ہندوستان کے لیے یکساں ہو۔"

یعنی ایسا دیوانی قانون بنایا جائے گا، جس میں ہندو، مسلمان وغیرہ کی کوئی تفریق نہ ہو گی اور وہ اسلامی ضابطہ نکاح وطلاق و میراث وغیرہ کا پابند نہیں ہو گا۔ جیسا کہ ہندوستان کے وزیر قانون کے اس بیان سے واضح ہے، جو انہوں نے بمبئی میں ایک

پریس کانفرنس میں دیا کہ :۔

"ہندوؤں کے قانون میں جو اصلاحیں قانون کے ذریعہ کی جارہی ہیں، مستقبل قریب میں اس اصلاح شدہ قانون کا اطلاق ہندوستان کی آبادی کے تمام طبقوں پر ہو سکے گا"
(ریاست کانپور۔ اگست ۱۹۵۵ء)

پھر دہلی کی نشرگاہ سے یکساں ضابطہ دیوانی کی ضرورت پر تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"آئندہ ملک میں جو قوانین وضع ونافذ ہوں گے، وہ تمام فرقوں کے لیے کیے جائیں گے"
(صدقِ جدید ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

شادی طلاق کا قانون

مسلمانوں کو شدھ کرنے اور اکثریت میں ضم کرنے کے ارادہ سے دستور ہند کے باب ۱۴ کی دفعہ ۴۴ کے ماتحت ہندوستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون ہندو میرج اینڈ ڈائی وورس ایکٹ کے نام سے پاس کیا۔ جس کی ضروری دفعات یہ ہیں :۔

دفعہ ۲۔ (۱) یہ بل عائد ہوگا۔

(سی) ہر اس شخص پر جو ہندوستان کا باشندہ ہو۔ اگر وہ مسلمان، عیسائی، پارسی، یہودی ہے، تو اس پر لاگو نہ ہوگا۔ بشرطیکہ وہ ہندو قانون یا کسی ہندو رواج یا کسی ہندو رسم کا پابند نہ ہو (یعنی اگر مسلمان کسی ہندوانہ رسم کا پابند ہوگا، تو یہ اس پر بھی لاگو ہوگا)

وضاحت :۔ اس قانون کے معنی میں مندرجہ ذیل اشخاص مذہباً ہندو سمجھے جائیں گے :۔

(بی) قانونی یا غیر قانونی لڑکے، جن کے ماں باپ میں سے کوئی ایک ہندو ہو اور ان لڑکوں پر بھی عاید ہوگا، جن کی پرورش اس قبیلہ، ذات یا خاندان کے فرد کی طرح ہوتی ہو، جس سے ان کے ماں یا باپ کا تعلق تھا۔

(سی) وہ شخص جو تبدیلی مذہب سے ہندو ہو گیا ہو یا دوبارہ تبدیلی مذہب سے ہندو ہو گیا ہو۔

۲۔ اس ایکٹ کے مطابق اُس شخص کو بھی ہندو تصوّر کیا جائے گا، جو مذہباً ہندو نہ ہو (یعنی مسلمان، عیسائی یا پارسی ہو) مگر ذیلی دفعہ (۱) پوری کرتا ہو۔

نوٹ: ذیلی دفعہ کا مطلب اس قانون کی دفعہ ۲ کی وضاحت میں کہہ دیا گیا ہے۔

دفعہ ۱۴۔ تبدیلی مذہب کی صورت میں علیحدگی (طلاق) کی درخواست کا حق اس فریق کو ہوگا، جو ہندو ہو۔

سپیشل میرج ایکٹ

اسی طرح ایک دوسرا قانون اسپیشل میرج ایکٹ کے نام سے منظور کیا گیا ہے۔ اس کی دفعہ (۷) کا تعلق نکاحوں کی رجسٹریشن وغیرہ سے ہے کہ ہر مرد خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ جس مذہب کی عورت سے چاہے شادی کر سکتا ہے اور اسی طرح ہر عورت خواہ کسی مذہب کی ہو، جس مذہب کے مرد سے چاہے شادی کر سکتی ہے۔ قانون ہر ایسے عقد کو جائز تسلیم کرے گا۔ اس ایکٹ کی رو سے وہ شادیاں بھی رجسٹر کرانی پڑیں گی، جو چالیس پچاس سال قبل ہو چکی ہیں۔ اس بل کی دفعہ ۱۵ میں کہا گیا ہے کہ اس بل کے تحت ہونے والی شادی کے تحت ایک شخص اپنے غیر منقسم

خاندان سے الگ ہو جائے گا اور اسے وراثت کے بارے میں اپنے پرسنل لاء کو چھوڑنا پڑے گا۔

مدراس کے مسلم لیگی ممبر مسٹر پی، پوکر نے ترمیم پیش کی کہ اس بل کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہو۔ اس کی زد مسلمانوں کے پرسنل لاء یعنی شریعت پر پڑتی ہے۔ کیونکہ شریعت نے مسلم عورت کا عقد غیر مسلم سے سرے سے ناجائز قرار دیا ہے۔ اور مسلم مرد کو بھی اجازت عقد خاص خاص مذہب والی غیر مسلمہ کے ساتھ دی ہے اور یہ بل صریح مداخلت فی الدین ہے۔

پنڈت نہرو کی چال

مسٹر پوکر کے احتجاج کے جواب میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں ایک طویل تقریر کی اور ایوان کے مسلمان ممبروں کو یہ بل رضاکارانہ طور پر تسلیم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ:۔

"میرا اپنا خیال یہ ہے کہ قوم کی تعمیر کے لیے ہمارے طریقہ کار میں یکسانیت اور جامعیت ہونی چاہیے۔ اگر آپ ہندو برادریوں کی رکاوٹوں، اس کی ذات کی پیچیدگیوں اور مسلمان دوسری (غیر مسلم) برادریوں سے اختلافات ختم نہیں کریں گے، تو یاد رکھیئے! کہ آپ اس بنیادی تصور کی تعمیر مکمل نہ کر سکیں گے، جس کا ہم بہت چرچا کرتے رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو فرقہ پرستی کہتے ہیں، وہ ان ہی موانعات کی طرف اشارہ کرتی ہے"

(صدق جدید ۱۵ راکتوبر ۱۹۵۵ء)

اس ترغیب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایوان کے کسی مسلمان ممبر نے مسلم لیگی ممبر مسٹر پوکر کی تائید

نہ کی اور یہ قانون جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہندویت اور برہمنیت میں ادغام اور انضمام کے دروازے کھولتا ہے منظور ہوگیا۔ جس پر عمل درآمد کے بعد ملت اسلامیہ ہندیہ کا انفراد و امتیاز، تشخیص و تخصیص کا کوئی نشان باقی نہ رہے گا

شادیوں پر پابندی

یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ معاشرہ کے جس جس روزن سے آفتابِ اسلام کی روشنی چھنتی نظر آتی ہے، اسے فی الفور بند کرنے کے احکام جاری کردیئے جاتے ہیں - ہندوستان میں ملازمتوں کی دنیا کے اندر اگر مسلمان کہیں کہیں نظر آتا ہے، تو وہ مرکزی محکمے ہیں، جہاں سے اسے نکالنے کے لیے وزیرِ اعظم نے یہ اعلان جاری کیا کہ :-

"جو لوگ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی بھی رکھتے ہیں - اسے آئندہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں نہیں لیا جائے گا اور جو لوگ ملازمت کے دوران میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی سے شادی کریں گے ، وہ برطرف کئے جاسکیں گے"

(صدق جدید ۲۲، اکتوبر ۱۹۵۴ء)

اس طرح مسلمانوں پر نہ صرف ملازمت کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی گئی ، بلکہ انہیں ایک سے زائد شادی کرنے کے اسلامی حق سے بھی قانوناً محروم کردیا گیا -

بے پردگی کی کوشش

ادھر محکمہ فنانس دکن نے مسلمان خواتین کو بے پردہ کرنے کے لیے یہ ہدایات جاری کیں کہ :-

"فوٹو داخل کرنے کے باب میں پردہ نشین وظیفہ یاب خواتین کا تعاون حاصل

کیا جائے - یہ عمل تدریجی طور پر اختیار کیا جائے ۔ مہتمم خزانہ کو اس پر اصرار کرنا چاہئیے - لیکن وہ انہیں اس پر مجبور نہیں کر سکے گا"

(صدق جدید ۴ ، نومبر ۱۹۵۵ء)

افسر خزانہ کی حیثیت مجسٹریٹ درجہ اول کی ہوتی ہے اور قانوناً اگر کسی امر میں وہ اصرار کرے اور دوسرا انکار کرے ، تو وہ توہین عدالت کا مرتکب ہوتا ہے جس کی اسے سزا بھگتنی پڑتی ہے ، جو قید یا جرمانہ دونوں صورتوں میں دی جا سکتی ہے۔ مگر دُنیا کو دھوکا دینے کے لیے اس حکم میں یہ الفاظ بڑھا دیئے گئے ، کہ وہ انہیں "مجبور نہیں کر سکے گا" حالانکہ "اصرار" کے بعد "مجبور نہ کرنے" کی شرط خود بخود بیکار و بے معنی ہو جاتی ہے - اس لیے مولانا عبدالماجد صاحب دریاباذی نے لکھا کہ :-

"اس بحث میں پڑے بغیر کہ "اصرار" کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور جبر کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے - دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شریعت کے باندھے ہوئے بند کس تیزی کے ساتھ اور کتنے مختلف طریقوں سے ٹوٹتے ہی چلے جاتے ہیں - حکومت کو براہ راست پردہ و بے پردگی سے اور علیٰ ہذا تصویر کشی سے کوئی واسطہ نہیں - لیکن اس اصولی بے تعلقی کے باوجود اس کے احکام و قواعد کی زد ہماری دینی تہذیب اور ملی معاشرت کے ایک ایک جزئیہ پر آ کر پڑتی رہتی ہے یا نہیں ، مقصود جو کچھ بھی ہو لیکن ہدف گھوم پھر کر وہی اسلامی ثقافت و معاشرت ! ے

کماں جانب دیگر می کشد
مگر تیر بر جانِ با می زند (نجوم الصدف)

ترکِ اسلام کی ترغیب

تعلیمی اور قانونی اداروں کے ذریعہ مسلمانوں کو بتدریج شدھ کرنے کی کوششوں کے علاوہ سماجی اداروں کے ذریعہ بھی یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہاں مختلف طرق سے کوشش جاری ہے۔ مثلاً

الف : گاندھوی مکتب کے مشہور و معروف رہنما آریہ ونوبھاوے نے ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو اپنی پرارتھنا سبھا میں "مذاہب کے امتزاج" پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ترغیباً" کہا کہ :-

" اب یہ ہمارے عیسائی بھائیوں کا کام ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ ان کے غیر ملکی ساز و سامان ختم ہو چکے ہیں۔ نیز اس بات پر توجہ کریں کہ ان کی صلاحیتوں کے لیے ہندوستانی پس منظر ہی فطری طور پر موزوں و مناسب ہے۔ انہیں اسی کو سہارا دینا چاہیے۔ کامل بجذب ہو جانے کے اسی مسلک کی طرف میں اسلام اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو بھی دعوت دوں گا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں نے اب تک ہندوستان سے باہر سے اپنی رسموں اور دوسرے روابط کا رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ مگر اب انہیں ہندوؤں کے تہذیبی پس منظر سے اجنبی نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ برہما کی تعلیمات کو فائدہ کے لیے اپنے اندر جذب کر لینا چاہیے۔ اس طریق کار سے ان کی نظریں وسیع ہوں گی۔ ان کے مذہبی اور نظریاتی دائرول میں رواداری پیدا ہوگی اور ان کی تہذیب میں درخشانی ہویدا ہوگی۔ اس تعاون سے ہمیں اپنی مشترکہ تہذیب کے ارتقاء میں بڑی مدد ملے گی۔ سمجھ لیجئے کہ

ہم اب ماضی کے دھندلکوں کو چھوڑ کر مستقبل کے اجالوں سے ہاتھ ملا رہے ہیں"

ہر شخص مانتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں بھائی چارہ پن اور رفاقت کی بے نظیر روح پائی جاتی ہے۔ اسلام کے معنی امن کے ہیں اسی لیے چاند کو اسلام کا نشان مانا گیا ہے۔ کوئی شخص جو امن کی پیاس نہیں رکھتا یا دردمندی اور دیا کا جذبہ نہیں رکھتا، وہ مسلمان نہیں ہے اس کے برخلاف ہر وہ شخص جو امن پسند ہے اور دردمندی بھی رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ خواہ اس پر ایسا لیبل لگا ہوا ہو یا نہ ہو، میں تو اسے سچا مسلمان ہی سمجھتا رہوں گا۔

اسی طرح عیسائی نظام حیات میں محبت اور خدمت دو خاص پہلو ہیں میں ان تصورات پر چلنا چاہتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں میں ان مذہبوں کے پیغمبروں اور بزرگوں کے چرنوں میں بیٹھنا اور کچھ حاصل کرنا چاہ رہا ہوں اگر کوئی شخص مجھے تھوڑا عیسائی اور تھوڑا مسلمان کہے، تو میں ایسا کہلوانا پسند کروں گا۔ ایسا کرتے سے میری ہندویت کو ضرر نہیں پہنچے گا، بلکہ وہ اور آگے بڑھے گی۔ اسی طرح اگر عیسائیت اور اسلام کے ماننے والے بھی ایسا ہی کریں (برہما کی تعلیمات سے فائدہ اٹھائیں) تو اُن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۱ر مارچ ۱۹۵۵ء)

ایک طرف سے تو عیسائیت اور اسلام کو ہندوستانی بنانے یعنی INDIAN-IZE کرنے کے لیے اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائی اگر

ملک میں اہمیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو وہ برہما کی تعلیمات کو اپنائیں، جو عیسائیت اور اسلام کے مقابلہ میں (نعوذ باللہ) زیادہ مکمل ہیں تاکہ ہندوستان میں تہذیب کی یکسانیت نظر آئے۔ اور

قبولِ کفر کا مشورہ

(ب)۔ دوسری طرف سے مسلمانوں کو ڈرایا اور دھمکایا جا رہا ہے۔ جس کی تفصیل ایسوسی ایٹیڈ پریس کی اس خبر سے معلوم ہوتی ہے:۔

"نئی دہلی۔ یکم اکتوبر۔ ستنا (مدھیہ پردیش) میں جن سنگھ کے زیر اہتمام ایک پبلک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اس پارٹی کے ایک لیڈر حکم چند نے کہا کہ شہر میں تین قسم کے غنڈے ہیں۔ (۱) مسلمان غنڈے (۲) وہ ہندو غنڈے جو مسلمانوں کی امداد کرتے ہیں اور (۳) وہ سرکاری افسر جو مسلمانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہم ان سب غنڈوں کا دماغ درست کر دیں گے۔ حکم چند نے کہا کہ یہ مسلمان مولا بخش اور غلام غوث ایسے نام کیوں رکھتے ہیں۔ انہیں یہ نام ترک کر کے رام غلام اور مولا رام ایسے نام رکھنے چاہئیں۔ انہیں "رام نام" سے محبت کرنی ہوگی۔ ورنہ ان کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ مسلمانوں کو اپنے تہوار بھی نہیں منانے چاہئیں۔ انہیں ہولی، دسہرہ اور بسنت منانی چاہئیے۔ وہ آخر محرم کیوں مناتے ہیں۔ جو ایک تہوار ہے۔"
(نوائے وقت ۲، اکتوبر ۵۵ء صہ ۶ کالم ۱)

ایسی تقریریں روزانہ کسی نہ کسی ایسے شہر میں ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں مسلمان کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ ان تقاریر کے بعد وہاں طے شدہ منصوبہ کے ماتحت مسلمانوں

کو حوالۂ شمشیر و آتش کرنے کے لیے عملی کارروائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مسلمان خوفزدہ ہو کر محافظانِ امن یعنی پولیس کو اطلاع دیتے ہیں۔ وہ اس وقت تک خاموش رہتے ہے، جب تک وہاں خون خرابہ نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ انہیں مظلوم مسلمانوں کو پکڑ کر جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیتی ہے، جنہیں پہلے سے نشانہ ستم بنایا جا چکا ہوتا ہے اور کسی ہندو ظالم کو پوچھا تک نہیں جاتا۔

مسلم لیگ پر پابندی

(ج)۔ جہاں مسلمان ذرا اکثریت میں ہیں، وہاں یہی فریضۂ ترہیب خود پنڈت جواہر لعل نہرو ادا کرتے ہیں۔ گو وہ بیرونی دنیا پر خود کو امن کا دیوتا ظاہر کرنے کے لیے اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی برہمنی فطرت نہیں بدلی۔

ہندوستان بھر میں جنوبی ہند بالخصوص مالا بار ہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمان کچھ منظم شکل میں موجود ہیں۔ وہاں ابھی تک مسلم لیگ زندہ ہے جس کا اس علاقہ میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ وہ عام انتخابات میں اس وقت تک حصہ لیتی ہے اور مخالفین کو شکست دینے میں کامیاب رہتی ہے اور اس کی یہ مقبولیت پنڈت جواہر لعل نہرو پر ناگوار گزرتی ہے۔ پنڈت جی دسمبر ۱۹۵۵ء میں جب اس علاقہ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے دورہ کرتے ہیں، تو ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جن سنگھ کے مشن کی یوں تائید کرتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں مسلم لیگ جیسی جماعت کے لیے کوئی جگہ نہیں"

حالانکہ مسلم لیگ کا جرم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ فرقہ وار جماعت اور

صرف مسلمانوں کی اسی طرح نمائندہ ہے۔ جس طرح ہندو مہاسبھا یا جن سنگھ وغیرہ فرقہ دارانہ پارٹیاں ہندوؤں کی نمائندہ ہیں، مگر ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ ملک میں فتنہ فساد برپا کرنے کے باوجود ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاتی اور آئینی طور پر اپنے حقوق کی حفاظت کرنے والی مسلم لیگ کا وجود ناقابل برداشت قرار دیا جاتا ہے اور اس پر پابندی لگائی جا رہی ہے کہ وہ اپنا وجود خود ہی ختم کر دے ورنہ ...... ! جس سے حکومت ہند کی سیکولرازم اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی جمہوریت پسندی بے نقاب ہو کر رہ جاتی ہے۔

اقتصادی دباؤ

ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے آخری دباؤ اقتصادی حملہ کے ذریعہ ڈالا جا رہا ہے۔ یو، پی میں زیادہ تر زمینداریاں مسلمانوں کی تھیں۔ وہاں زمینداری سسٹم منسوخ کر کے سب زمینیں مسلمانوں سے ہتھیا لی گئی ہیں اور انہیں بے کار کر دیا گیا ہے۔ تجارت کا دروازہ ان کے لیے اس طرح بند کر دیا گیا ہے کہ اوّل تو بڑے بڑے کاروبار کے لیے مسلمانوں کو لائسنس یا پرمٹ ہی نہیں دیئے جاتے اور اگر کہیں کوئی مسلمان کام کر بھی بیٹھے، تو اسے ناکام کرنے کے لیے مسابقت حاصل کرنے یا بائیکاٹ کرنے کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس دباؤ کا اثر زیادہ تر دیہاتی دنیا میں دیکھنے میں آیا ہے، جہاں کے غریب مسلمان دکاندار محض پیٹ بھرنے کی خاطر اس دباؤ کے ماتحت شدھ ہونا گوارا کر لیتے ہیں۔

وہاں چند تجارتیں اور پیشے ایسے بھی ہیں، جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً قصائیوں کا پیشہ جس پر لاکھوں مسلمانوں کا گزارہ تھا۔ جس کا اندازہ ایک ہندو

باہر دباغت کی رپورٹ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ذبیحہ گاؤ کی ممانعت سے قبل ۔

"ہندوستان سے ہر سال قریباً ۲۶ کروڑ روپے کا گائے کا چمڑہ دساور کو جاتا تھا۔ جس کے ذریعہ ۲۴ لاکھ دیہاتی باشندوں کو اس صنعت سے روزگار حاصل ہوتا تھا۔ (نیشنل ہیرلڈ۔ لکھنؤ ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۵ء)

مگر وہاں ذبیحہ گاؤ کی قانوناً ممانعت کر کے نہ صرف لاکھوں قصائیوں کو بے روزگار بنا دیا گیا ہے، بلکہ چمڑے کا کام کرنے والے لاکھوں مسلمانوں کو بھی بیکار کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر سمپورنانند ہوم منسٹر یو۔پی کے بیان کے مطابق وہاں:

"اب تو مذہبی تقریبات تک کے موقع پر بھی گائے نہیں کٹنے پاتی"

(صدق جدید ۱۴ر اکتوبر ۵۵ء)

کیونکہ وہاں گائے ذبح کرنے کی سزا انتہائی سنگین رکھی گئی ہے۔ یہ جرم ناقابل ضمانت قرار دیا گیا ہے اور اس کا بار ثبوت عدل و انصاف کی تمام مقتضیات کے خلاف غریب ملزم پر ڈال دیا گیا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہاں محض ایک گائے ذبح کرنے کے جرم میں مسلمانوں کو آٹھ آٹھ سال قید با مشقت تک کی سزائیں دی گئی ہیں۔ جس کی سینکڑوں عدالتی مثالیں شاہد عدل ہیں۔

جھٹکا کا رواج

ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کے بعد مجبوراً مسلمانوں کو بکری کے گوشت پر اکتفا کرنا پڑا، مگر اس کے کھانے پر بھی ایک قسم کی قدغن لگا دی گئی ہے۔ یعنی اسے حلال طریقہ سے ذبح کرنے کی ممانعت شروع کر دی گئی ہے اور قانونی طور پر انہیں حلال طریقہ پر ذبح کرنے

کی بجائے جھٹکا کرنے کی تجاویز بعض میونسپلٹیوں میں پیش ہو چکی ہیں شلاً :

"حیدرآباد میونسپل کارپوریشن میں انسداد بے رحمی جانوراں کے نام پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ جانوروں کو آدھی گردن کاٹنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ایک ہی ضرب سے ساری گردن کاٹ دی جائے"

(صدق جدید، ۲۰ راگست ۱۹۵۴ء)

اس طرح ملک میں جھٹکا کو عام رواج دینے اور مسلمانوں کو حرام کھانے پر مجبور کرنے کی ایک نئی مہم چلائی جا رہی ہے۔

آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ اسٹیشنوں پر پہلے مسلمان ہوٹل، مسلمان پانی، مسلمان خوانچہ فروش نظر آتے تھے، ان سب کو اس لیے ہٹا دیا گیا ہے۔ کہ اس سے ملک میں یکسانیت پیدا ہونے کی بجائے فرقہ پرستی کا جذبہ بڑھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اب ہندوستان کے کسی بھی اسٹیشن پر "مسلمان کھانے اور پانی" کا انتظام نہیں ہے۔ جس سے مسلمان مسافروں کو ازحد تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ وہ ہندو سے کھانا اس لیے نہیں لے سکتے کہ انہیں اس کے حلال ہونے کا یقین نہیں ہوتا اور اگر کبھی کبھار کوئی مجبور ہو کر سابقہ دستور کو رائج کرنے کی آواز بلند کر بیٹھتا ہے تو اسے جھٹ غداری کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے کہ اس متعصب فرقہ پرست نے ملک میں یکسانیت و یگانگت پیدا کرنے والے منصوبہ کو نقصان پہنچایا ہے۔

ملازمتوں پر قدغن

نام نہاد سیکولرازم کی نمائش کے لیے اگرچہ وہاں بڑی ملازمتوں میں خال خال مسلمان نام کے ملازم نظر آتے ہیں۔ مگر نچلے درجہ کے سرکاری دفاتر اور اداروں میں ہر قسم کی ملازمت کا دروازہ

مسلمانوں پر بند ہے۔ جس کی تصدیق دہلی کے انگریزی ہفتہ وار اخبار "لینک" کے ماہ دسمبر ۱۹۵۲ء کے ایک شمارہ کے مقالہ سے ہوتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ:-

"سرکاری ملازمتوں میں مسلمان اب گویا عنقا ہو گئے ہیں۔ بہت سے تو خود ہی پاکستان چلے گئے ہیں اور جو رہ گئے ہیں، وہ یہاں کے فرقہ پرست حکام کے غصہ و انتقام کا شکار ہو گئے ہیں۔ رہیں اب ہماری قانون ساز جماعتیں، تو وہ خود اکثریت کے ارکان سے بھری پڑی ہیں۔ وہ ان حکام کو اور شہ دے رہی ہیں۔ مرکزی سیکرٹریٹ میں بھی دیکھ لیجئے۔ مسلم حکام شاذ و نادر ہی ملیں گے اور جو بچارے ہیں بھی، وہ بھی بے بس اور ریفیوجی حکام جو پاکستان کی طرف سے جائز[1] شکایتیں لے کر آئے ہیں، وہ اگر یہاں کے مسلمانوں سے بغض رکھیں، تو یہ شاید قدرتی ہے اور صوبوں کی حالت تو مرکز سے بھی گئی گزری ہوئی ہے۔"

علانیہ شدھی ہندوستان کے مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لیے ان تمام ذرائع و وسائل کے علاوہ، جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ براہ راست اقدام یہ کیا گیا ہے۔ کہ ہندوستان کے کروڑ پتیوں نے شدھی کے منصوبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ہندو سبھا کی شدھی کی شاخ کی سرپرستی شروع کر دی ہے اور روپے، پیسے سے اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں سیٹھ گھنشام داس برلانے دیہاتی مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لیے اکھل بھارتیہ شدھی سبھا کو پچاس لاکھ روپے دیئے ہیں اور اس گرانقدر دان کی وجہ سے انہیں ان

---

[1] حالانکہ وہ سب بے بنیاد ہیں۔

سبھا کا اعزازی صدر بنا دیا گیا ہے۔

شدھی کا سب سے بڑا مرکز گڑگاؤں میں قائم کیا گیا ہے، جو وہاں کے ستر ہزار میواتیوں کو شدھ کرنے کی مہم چلا رہا ہے۔ راجستھان کی تمام ریاستوں میں شدھی کے مرکز قائم کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں اس وقت تک ستر ہزار مسلمان ہندو بنائے جا چکے ہیں۔

جمیعۃ العلماء ہند جو مسلم لیگی یا فرقہ وارانہ ادارہ نہیں بلکہ کانگریسی اور قوم پرست جماعت ہے، کے دفتر میں، اس کی صوبائی اور اضلاعی شاخوں کی بھیجی ہوئی خبروں کے مطابق :۔

"پیپسو یونین میں ۱۷ ہزار۔ ہماچل پردیس میں ۲۳ ہزار۔ بھرت پور میں ۷۰ ہزار۔ اجمیر و مارواڑ میں ۴۷ ہزار اور مغربی یوپی کے اضلاع میں تقریباً ۲۰ ہزار مسلمانوں کو صرف گذشتہ تین سال کے عرصہ میں مرتد بنا لیا گیا ہے۔ ان ایک لاکھ ۸۲ ہزار انسانوں نے بخوشی آریہ مذہب قبول نہیں کیا، بلکہ جان و مال کی لگاتار دھمکیوں اور باعزت زندگی، کاروبار اور روپے کے لالچ کے بعد انہیں اپنا اسلامی نام ترک کر کے شدھ ہو جانے پر بمشکل آمادہ کیا گیا ہے۔"

(نوائے وقت ۱۱ر جنوری ۱۹۵۶ء)

حال ہی میں ہندو سبھا کی شدھی شاخ نے اس علاقہ میں مزید ایک لاکھ مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اعلان کیا ہے۔ مگر حکومت ہند لیاقت نہرو معاہدہ کے باوجود اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کر کے شدھی کی اس تحریک کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ حالانکہ مذکور الصدر معاہدہ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اپنے اپنے ملک

میں اقلیتوں کے جبری تبدیلی مذہب کو روا نہ رکھیں گی اور ایسی جماعتوں کے خلاف سخت کارروائی کریں گی۔

ظلم کی انتہا

ایک طرف تو حکومت ہند، ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے والی سرگرمیوں کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی بلکہ سرپرستی کر رہی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں سے یہ تقاضا کر رہی ہے کہ :-

"یہاں کے مسلمان بھی اس حکومت کو اپنی ہی حکومت سمجھیں"

گویا ظالم مظلوم کی گردن پر چھری پھیرتے وقت اس سے اس امر کا بھی متمنی ہے کہ وہ اسے اپنا مونس و ہمدرد سمجھے ؏

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے

کفر و اسلام کی کشمکش

اسلام سے ہر زمانہ میں کفر برسرپیکار رہا ہے اسلامی ممالک جو مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں، اب تک برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہے اور اب انہیں ہندو اپنے استعمار پرستانہ اغراض کے لیے استعمال کرنے کی فکر میں ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ پاکستان میں احیائے اسلام کی جو تحریک چل رہی ہے اگر وہ کامیاب ہو گئی تو پاکستان اسلام کا ایک طاقتور مرکز بن جائے گا جو اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوگا۔ اس لیے وہ ایک طرف تو اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں سے پاکستان میں اس تحریک کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف اسلامی ممالک کی برادری میں انتشار و خلفشار پیدا کر کے انہیں پاکستان

کے خلاف اکسا اور بھڑکا رہا ہے ۔ تاکہ نہ پاکستانی اپنے ہندوستانی بھائیوں کی مدد کر سکیں اور نہ دوسرے اسلامی ممالک تک ان مظلوموں کی شنوائی ہو سکے ۔ ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان سے اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹانے کی مہم زوروں پر ہے ۔ بعض اسلامی ممالک کا ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہندوستانی مسلمانوں کے موت کے وارنٹ پر دستخط کرنا ہے ۔ جس کا ایک دن بمصداق ؎ ۔

کبردنی خویش ، آمدنی پیش

انہیں بھی خمیازہ بھگتنا پڑے گا ۔ کیونکہ مکافات کا چکر تو بدستور چل ہی رہا ہے ۔

لمحۂ فکریہ

پیش کردہ حقائق جہاں عالم اسلام کو اس امر پہ غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کو کس طرح جبری شدھی سے بچایا جا سکتا ہے ۔ وہاں وہ اس بات کے بھی شاہد عادل ہیں کہ اگر پاکستان نہ بنتا ، تو ان لوگوں کے ساتھ بھی متحدہ ہندوستان میں یہی سلوک روا رکھا جاتا ، جو آج پاکستان میں اطمینان اور عزّت کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے ہیں ۔

ہندو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ہی فکر میں نہیں ، بلکہ اس کی غاصبانہ نظر پاکستان پر بھی ہے ۔ وہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان میں شامل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے ۔ مشرقی پاکستان کا ہندو اس سلسلہ میں پوری مستعدی کے ساتھ کام کر رہا ہے اور وہ یہ تمام " خدمت " یہاں کے خود غرض اور مفاد پرست مسلمانوں کے ذریعہ انجام دے رہا ہے ۔ جس

پر "تدوین آئین" کے باب میں بخوبی روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔ مغربی پاکستان میں علماء کرام کے خلاف جو انیٹی بلا فرنٹ کام کر رہا ہے ، وہ بھی اسی سلسلہ کی ہی ایک کڑی ہے ۔ پاکستان کی تعمیر میں طبقہ علماء کا بہت بڑا حصہ ہے اور یہی طبقہ پاکستان کے لیے اسلامی آئین کا مطالبہ کر کے اس کے استحکام کے لیے کوشاں ہے ۔ جس کے نفاذ کے ساتھ خدائی امداد بھی اس کے شامل حال ہو جانی یقینی ہے ۔ جیسا کہ اس کا وعدہ ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا	اللہ اُن کے ساتھ ہے جو پرہیزگار
وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝	ہیں اور نیکی کرتے ہیں ۔

(النحل ۱۶/۱۴)

اس لیے دشمنانِ پاکستان عوام میں پاکستان کے ان مخلص خدام یعنی علماء کرام کے خلاف نفرت وحقارت کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں بلطائف الحیل ذلیل وبدنام کرنے میں مصروف ہیں ۔ تاکہ لوگ ان کی آواز پر کان نہ دھریں اور پاکستان لا الٰہ الا اللہ کی بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے اور یہ "خدمت" انہی لوگوں سے لی جا رہی ہے ، جو شروع سے تعمیر پاکستان کے مخالف تھے ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے ، پاکستانی مسلمانوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے ۔ انہیں استحکام پاکستان کے لیے بدل وجان کوشاں ہونا چاہیے اور ملک میں جو عنصر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہے اسے محترمہ فاطمہ جناح کے ارشاد کے مطابق بے نقاب کر کے پاکستان کی سالمیت کو خطرہ سے بچانا چاہیے ورنہ ع ۔

تمہارا نام بھی نہ ہوگا داستانوں میں

علامہ اقبال کی اپیل

طبقۂ علماء کو مٹانے کی کوشش کرنا، اسلام کو مٹانے کی کوشش کرنا ہے۔ کیونکہ علامہ اقبالؒ کے ارشاد کے مطابق یہی اسلام کی قوتِ عظیم کا سرچشمہ ہیں اور اسی لیے علامہ اقبالؒ نے حکیم احمد شجاع صاحب سابق سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی سے بچشم تر فرمایا تھا کہ :-

"ان (دینی) مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملا اور یہ درویش نہ رہے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح، جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سواء اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں آگرے کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور اس کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

(خون بہا حصہ اول ص ۴۳۹)

ہمارا فرض

مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان مصیبت میں گرفتار ہے اور پاکستان کا مسلمان اس کے دکھ درد کو محسوس نہیں کرتا، تو وہ مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں رہتا۔ ہندوستانی

مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کا مملکتِ پاکستان میں کوئی حصّہ نہیں ہوگا قیامِ پاکستان کے لیے قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش قربانیاں دی ہیں۔ اب ہمیں بھی ان کی ہر ممکن اور جائز امداد کرنی لازمی ہے اور اس کا واحد طریق یہ ہے کہ پاکستان میں ایک مضبوط اور صحیح اسلامی نظام کی بنیاد رکھ دی جائے تاکہ اسے امدادِ الٰہی حاصل ہو سکے۔ اس کے حاصل ہوتے ہی کفر کی تمام قوتیں خود بخود مفلوج ہو کر رہ جائیں گی۔ ورنہ انجام معلوم!

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ۔

تمت بالخیر

ہے جن کے فیضِ قدم سے بہارِ صحنِ چمن
نہی کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں

تعمیرِ پاکستان اور علماء ربانی

☆

مصنّفہ

منشی عبدالرحمٰن خاں

○

ناشر

شیخ اکیڈیمی، بل روڈ، لاہور